AXIS BANK

AL-AMEEN MEMORIAL MINORITY COLLEGE

Statement Generated By :- 202824

Joint Holder :- -
JOGI BATTALA
BARUIPUR
SOUTH 24 PARGANAS
WEST BENGAL
700145

Customer No :883818780
Scheme :SB-TRUST/SOCIETY/NGO/GOVT
Currency :INR

Statement of Account No :259010100067139 for the period (From : 01-04-2019 To : 31-03-2020)

Tran Date	Chq No	Particulars	Debit	Credit	Balance	Init. Br
		OPENING BALANCE			3557.05	
27-05-2019		SAK/CASH DEP/SAK123729094/259/BY CASH		210000.00	213557.05	259
28-05-2019		SAK/CASH DEP/SAK123958216/259/BY CASH		3680.00	217237.05	259
28-05-2019	312851	NETAJI SUBHAS OPEN UNIVERSITY	3680.00		213557.05	259
29-05-2019		SAK/CASH DEP/SAK124221017/259/BY CASH		300.00	213857.05	259
30-05-2019		SAK/CASH DEP/SAK124306246/2183/BY CASH		100.00	213957.05	2183
30-05-2019		SAK/CASH DEP/SAK124462342/259/BY CASH		1700.00	215657.05	259
31-05-2019		SAK/CASH DEP/SAK124617087/2183/BY CASH AMMC190199		100.00	215757.05	2183
31-05-2019		SAK/CASH DEP/SAK124618182/2183/BY CASH AMMC190391		100.00	215857.05	2183
31-05-2019		SAK/CASH DEP/SAK124618865/2183/BY CASH AMMC190386		100.00	215957.05	2183
31-05-2019		SAK/CASH DEP/SAK124705150/259/BY CASH		3200.00	219157.05	259
01-06-2019		BRN-BY CASH SELF		2400.00	221557.05	259
03-06-2019		SAK/CASH DEP/SAK125029016/445/ABBAS MONDAL / AMMC		100.00	221657.05	445
03-06-2019		SAK/CASH DEP/SAK125064787/2183/BY CASH AMMC190200		100.00	221757.05	2183
03-06-2019		SAK/CASH DEP/SAK125066202/2183/BY CASH AMMC190148		100.00	221857.05	2183
03-06-2019		IMPS/P2A/915414062705/FAHMIDAT/KOTAK MAH/MBEDUCAT		100.00	221957.05	259
03-06-2019		BRN-BY CASH CASH DEPOSIT		6600.00	228557.05	259
03-06-2019		SAK/CASH DEP/SAK125231157/2794/BY CASH		100.00	228657.05	2794
03-06-2019		SAK/CASH DEP/SAK125231266/2794/BY CASH/safirul mo		100.00	228757.05	2794
04-06-2019		SAK/CASH DEP/SAK125290459/3809/BY CASH/faizuddin		100.00	228857.05	3809
04-06-2019		SAK/CASH DEP/SAK125406966/2183/BY CASH		100.00	228957.05	2183
04-06-2019		SAK/CASH DEP/SAK125440140/259/BY CASH		14600.00	243557.05	259
04-06-2019		SAK/CASH DEP/SAK125490693/259/BY CASH		2100.00	245657.05	259
06-06-2019		SAK/CASH DEP/SAK125562990/2183/BY CASH AMMC191204		100.00	245757.05	2183
06-06-2019		SAK/CASH DEP/SAK125587548/2785/BY CASH AMMC191140		100.00	245857.05	2785
06-06-2019		BRN-BY CASH CASH DEPOSIT		3600.00	249457.05	259

Al-Ameen Memorial Minority College
ESTD.-2004
Baruipur
Kol.-145
Jogibattala

31-07-2019		SAK/CASH DEP/SAK135870647/259/SELF		2700.00	1438219.05	259
01-08-2019		SAK/CASH DEP/SAK135959486/259/SELF		1330.00	1439549.05	259
01-08-2019		SAK/CASH DEP/SAK135961177/259/SELF		1000.00	1440549.05	259
01-08-2019		SAK/CASH DEP/SAK135961633/259/SELF		4000.00	1444549.05	259
02-08-2019		SAK/CASH DEP/SAK136155367/259/SELF		3330.00	1447879.05	259
02-08-2019	312884	SAK/CASH WDL/SAK136180570/259/BARUIPUR /TO CASH/S	120000.00		1327879.05	259
05-08-2019	312883	BRN-CLG-CHQ PAID TO TAIMUR RAHAMAN /UNITED BANK OF	100000.00		1227879.05	2568
08-08-2019	312885	SAK/CASH WDL/SAK137430597/259/BARUIPUR /TO CASH/S	180000.00		1047879.05	259
14-08-2019		BRN-BY CASH SELF		1600.00	1049479.05	259
14-08-2019		BRN-BY CASH SELF		100.00	1049579.05	259
09-09-2019	312886	SAK/CASH WDL/SAK142689461/259/BARUIPUR /TO CASH/S	100000.00		949579.05	259
17-09-2019		BRN-BY CASH SELF		12800.00	962379.05	259
30-09-2019		259010100067139:Int.Pd:01-07-2019 to 30-09-2019		9042.00	971421.05	259
29-10-2019	312887	SAK/CASH WDL/SAK151401866/259/BARUIPUR /SELF	50000.00		921421.05	259
13-11-2019	312888	SAK/CASH WDL/SAK154212353/259/BARUIPUR /TO CASH/T	50000.00		871421.05	259
14-11-2019	312889	SAK/CASH WDL/SAK154432636/259/BARUIPUR /SELF	50000.00		821421.05	259
15-11-2019		SAK/CASH DEP/SAK154697482/259/SELF		9175.00	830596.05	259
15-11-2019	312890	DD/NETAJI SUBHAS OPEN UNIVERSITY/BARUIPUR [WB]	9175.00		821421.05	259
18-11-2019		SAK/CASH DEP/SAK155018465/259/SELF		850.00	822271.05	259
18-11-2019	312891	DD/NETAJI SUBHAS OPEN UNIVERSITY/BARUIPUR [WB]	850.00		821421.05	259
19-11-2019	312892	DD/NETAJI SUBHAS OPEN UNIVERSITY/BARUIPUR [WB]	6625.00		814796.05	259
19-11-2019		DD Cancln 12409		9175.00	823971.05	259
19-11-2019		DD Cancln 12409	118.00		823853.05	259
19-11-2019		DD Cancln 12412		850.00	824703.05	259
19-11-2019		DD Cancln 12412	118.00		824585.05	259
23-12-2019		TRANSFER/TB/25-1346183600-93/NCPUL/NP181		104400.00	928985.05	248
26-12-2019	312893	SAK/CASH WDL/SAK162174316/259/BARUIPUR /TO CASH/T	40000.00		888985.05	259
31-12-2019		259010100067139:Int.Pd:01-10-2019 to 31-12-2019		7878.00	896863.05	259
04-01-2020	312894	SAK/CASH WDL/SAK163675099/259/BARUIPUR /SELF	200000.00		696863.05	259
06-01-2020		SAK/CASH DEP/SAK164023949/259/SELF		24100.00	720963.05	259
06-01-2020	312895	DD/NETAJI SUBHAS OPEN UNIVERSITY/BARUIPUR [WB]	24100.00		696863.05	259
17-01-2020	312896	SAK/CASH WDL/SAK166089400/259/BARUIPUR /SELF	50000.00		646863.05	259
17-01-2020	312897	SAK/CASH WDL/SAK166161465/259/BARUIPUR /TO CASH/S	50000.00		596863.05	259

...meen Memorial Minority College
ESTD.-2004
Baruipur
Kol.-145

URDU ADAB KA MUTALAA

Sk. Asgar Ali
Department of Urdu
Al Ameen Memorial Minority College

اردو ادب کا مطالعہ

Published by :
Al Ameen Memorial Minority College
Jogibattala, Baruipur, Kolkata 700145
Email :alameenmemorial@gmail.com
Ph No : 033-24370111

حصہ اول

1

اردو کا تاریخی پس منظر

اردو، جنوبی ایشیا کی ایک اہم اور بڑی زبان ہے۔ بر صغیر ہند کی آزادی کے بعد سے اس زبان کی مقبولیب میں اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔ یہ ہندوستان کی اٹھارہ (18) قومی زبانوں میں سے ایک ہے۔ یہ پاکستان کی سرکاری زبان ہے۔ حالانکہ اس زبان پر عربی وفارسی کے اثرات ہیں لیکن عربی وفارسی کے برعکس یہ ہندی کی طرح ایک ہند آریائی زبان ہے جو برصغیر ہند میں پید اہوئی اور یہیں اس کی ترقی ہوئی ۔ اردو اور ہندی دونوں جدید ہند آریائی زبانیں ہیں اور دونوں کی اساس یکساں ہیں، صوتی اور قواعدی سطح پر دونوں زبانیں اتنی قریب ہیں کہ ایک زبان معلوم ہونے لگتی ہیں لیکن لغوی سطح پر دونوں نے مختلف ذرائع سے اتنا زیادہ مستعار لیا ہے (اردو نے عربی اور فارسی سے، ہندی نے سنسکرت سے) کہ رواج اور طریقۂ استعمال کی سطح پر حقیقتاً دونوں کی شناخت علاحدہ اور خود مختار زبانوں کے طور پر ہوتی ہے۔ یہ فرق رسم الخط کی سطح پر کافی نمایاں ہے۔ ہندی کا رسم الخط دیونا گری ہے، جب کہ اردو کا رسم الخط فارسی وعربی ہے جس میں ہند آریائی زبان کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے مقامی طورپر ترمیم واضافہ کیا گیا ہے۔ ایک عام اندازے کے مطابق اردو اور ہندی کے بولنے والوں کو ملا کر دیکھیں تو یہ دنیا کی تیسری سب سے زیادہ بولے جانے والی لسانی آبادی ہے۔

اردو، پاکستان کی سرکاری زبان ہے۔ سرکاری اسکولوں، ضلع انتظامیہ اور عوامی ذرائع ابلاغ میں اس کا استعمال ہوتا ہے۔ پاکستان میں 1981 کی مردم شماری کے اعداد وشمار کے مطابق پاکستان میں اردو بولنے والے کی تعداد تقریباً ایک کروڑ دس لاکھ ہے۔ خاص کر کراچی اور پنجاب میں اردو بولنے والوں کی کثیر تعداد موجود ہے۔ ہندوستان میں اردو بولنے والوں کی تعداد تقریباً 4 کروڑ40 لاکھ (ہندوستان کی مردم شماری، 1991) ہے۔ سب سے زیادہ اردو بولنے والے اُتر پردیش میں ہیں۔ اس کے بعد بہار، آندھرا پردیش، مہاراشٹر اور کرناٹک کا نمبر آتا ہے۔ مشترکہ طورپر ان ریاستوں میں پورے ملک میں اردو بولنے والوں کی 85، فیصدی آبادی رہتی ہے۔ شہرِ دہلی ابھی بھی اردو ادب او ر طباعت کا بڑا مرکز ہے۔ ہندوستان اور پاکستان سے متصل ملکوں مثلاً افغانستان، بنگلہ دیش اور نیپال میں بھی اردو بولی جاتی ہے۔ برصغیر ہندوپاک سے باہر خاص طور سے خلیجی ممالک، مشرق وسطی، مغربی یوروپ، اسکینڈنیوائی ممالک (ڈنمارک، ناروے، سوئڈین)، امریکہ اور کناڈا میں اردو، جنوبی ایشیا کے مہجری مسلمانوں کی تہذیبی زبان اور لنگوا فرینکا بن چکی ہے

تاریخی اعتبار سے دیکھیں تو اردو کی ابتدا بارہویں صدی کے بعد مسلمانوں کی آمد سے ہوتی ہے۔ یہ زبان شمال مغربی ہندوستان کی علاقائی اپ بھرنشوں سے رابطے کی زبان کے طورپر اُبھری۔ اس کے

پہلے بڑے عوامی شاعر عظیم فارسی داں امیر خسرو (1253-1325) ہیں جن کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ انھوں نے اس نئی زبان میں دوہے، پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں کہیں۔ اس وقت اس زبان کو ہندوی کہا جاتا تھا۔ عہد وسطی میں اس مخلوط زبان کو مختلف ناموں سے جانا گیا۔ مثلاً ہندوی، زبان ہند، ہندی، زبانِ دہلی، ریختہ، گجری، دکنی، زبانِ اردوئے معلّٰی، زبان اردو، اردو۔ اس بات کے شواہد ملتے ہیں کہ گیارہویں صدی کے اواخر میں 'ہندوستانی' نام مروج تھا جو بعد میں ارد کا مترادف بن گیا۔ لغوی اعتبار سے اردو (اصل میں ترکی زبان کا لفظ ہے) کے معنی چھاؤنی یا شاہی پڑاؤ کے ہیں۔ یہ لفظ دہلی شہر کے لیے بھی مستعمل تھا جو صدیوں مغلوں کی راجدھانی رہی۔ ان سب باتوں کے باوجود اردو کے بڑے قلم کار انیسویں صدی کے آغاز تک اپنی زبان اوربولی کو ہندی یا ہندوی کہتے ہیں۔ ؂:

نہ جانے لوگ کہتے ہیں کس کو سرورِ قلب

آیا نہیں یہ لفظ تو ہندی زبان کے بیچ

اردو اور ہندی میں تفریق نوآبادیاتی اثرات کے تحت رونما ہوئی جب سیاسی جدید کاری کے عمل کے تحت تہذیبی شعور میں اضافہ ہونے لگا۔ درحقیقت اس کی شروعات فورٹ ولیم کالج (قیام 1800)، کلکتہ میں جان گلکرسٹ (1789-1841) کی سر براہی میں ہوگئی تھی۔ اس بات کے واضح اور وافر ثبوت ملتے ہیں کہ برطانوی حکمرانوں نے پہلے تو 'ہندی' کی اقسام کے سوال کو تہذیبی ورثے اور سماجی درجات سے منسلک کردیا اور بعد میں اسے مذہب اور سیاسی رسم کسی سے جوڑ دیا۔ لہٰذا، یہ فورٹ ولیم کالج ہی تھا جہاں ادبی نثر نگاری کے دو منفرد رجحانات سامنے آئے۔ ایک طرف تو اردو نثر کے طورپر میرامن کی ''باغ وبہار '' (1800-1802) اور حیدر بخش حیدری کی ''آرائش محفل'' (1804-1802) سامنے آئی تو دوسری جانب للّو لال کا ''پریم ساگر'' اور سادل مشرا کا ''ناسکیٹو پکھیان'' ہندی نثر کے نمونے ٹھہرے۔ بعد میں ہندوستان کی تحریک آزادی کے بڑھتے ہوئے رجحان کے ساتھ مہاتما گاندھی نے زبان کے مسئلے کی فرقہ واریت اور انگروزوں کے ذریعے اس سیاسی رنگ دیے جانے کو محسوس کیا۔لہٰذا انھوں نے دونوں رسم الخط میں لکھی جانے والی''ہندوستانی'' کےمشترکہ تصور کو ملک کی قومی زبان بنائے جانے کی حمایت کی۔ یہاں پر اس امر کا بیان دلچسپی کا حامل ہوگا کہ مہاتما گاندھی کی تجویز کہ ہندوستانی، مشترکہ تہذیب کی زبان ہے، سےکا فی پہلے راجا شیوپرساد نے 1857 میں قواعد کی اپنی کتاب میں اس بات کا اعادہ کیا تھا کہ ہندی اور اردو میں ملکی سطح پر کوئی اختلاف نہیں ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ''اس نامعقولیت کی شروعات ڈاکٹر گلکرسٹ کے عہد کے مولویوں اور پنڈتوں سے ہوئی۔ انھیں بالائی ہندوستان کی مشترکہ بولی کے قواعد بنانے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی لیکن انھوں نے دو قواعد لکھ ڈالے---- اس کے مضر اثرات یہ رونما ہوئے کہ ملکی زبان کے ایک قواعد کے بجائے—— قواعد کی دو مختلف اور متضاد درسی کتابیں تیار ہوگئیں، ایک مسلمان اور کایستھ لڑکوں کے لیے اور دوسری برہمن اور بنیوں کے لیے'' (سریواستو، ص:30) ۔ تفریق کی بیج بودی گئی تھی، تہذیبی نشاۃ ثانیہ کے بڑھتے ہوئے رجحان کی وجہ سے لسانی تفریق

کی جڑیں مضبوط ہونے لگیں۔ تقسیم کے بعد ہندوستانی کے تصور کی کوئی سرکاری پذیرائی نہیں ہوئی لیکن یہ مشترکہ بنیادی زبان عوام الناس کے دلوں پر راج کرتی رہی۔ حقیقت میں یہ زبان عوامی تہذیب کی سطح پر ترسیل کا ذریعہ ہے اور فلموں اور تمام طرح کے تفریحی پروگرام میں وسیع پیمانے پر استعمال کی جاتی ہے۔

اردو میں قواعد اور لغت سازی کی روایت تقریباً تین سو سال پرانی ہے۔ ابتدا میں یوروپی مستشرقین نے شروع ہو کر (Keteiaar) اس پر توجہ دی جس کا سلسلہ 17 ویں صدی میں ولندیزی اسکالر کیٹیار شولز

، شیکسپیر(Gilchirst;1800;) ، گلکرائسٹ(Ferguson;1773)، فرگوسن (Schultze;1744 ، (Platts;1884) ، پلاٹس(Fallon;1879) ، فیلن(Forbes;1848) ، فوربس(Shakespeare,1817) وغیرہ سے ہوتا ہوا

حصہ دوم

2

اردو ادب کا آغاز دہلی سے دور دکن میں پندرہویں ، سولھویں اور سترہویں صدی میں ہوا۔ شمال کے مغل حکمران عام طور سے فارسی کی سرپرستی کرتے تھے، جنوبی ہند (گولکنڈہ (موجودہ حیدر آباد) اور بیجاپور) میں نئی زبان (اردو) کو دربار کی سرپرستی حاصل ہوئی جس کا پہلے پہل ادبی استعمال صوفیائے کرام اور عوامی شاعروں نے کیا۔اس وجہ سے اس کا نام دکنی پڑا۔ نظامی (1421-1434)کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ دکن میں شعری بیانیہ کا اولین نمونہ ہے۔ وجہی (وفات:1635) کی تصنیف سب رس ایک تمثیلی داستان ہے۔ اسے اردو میں ادبی نثر کا پہلا نمونہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ دکن کے اہم اور مشہور شعرا میں محمد قلی قطب شاہ (وفات:1626) ، غواصی ؔ(وفات:1631)، نصرتیؔ (وفات:1674)، ابن نشاطی (وفات:1655) اور ولی اورنگ آبادی (وفات:1707) وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ ولیؔ کے کلام سے متاثر ہوکر دہلی کے شعرا نے اردو میں شاعری کی شروعات کی اور اس زبان کو شاعری کے لیے اتنا ہی موزوں ماننے لگے جتنا فارسی کو مانتے تھے۔ اس نے اردو کی ترقی کے لیے راہ ہموار کردی۔

اٹھارویں اور انیسویں صدی کو اردو کلاسیکی شاعری کا سنہرا دور کہا جاتا ہے جب زبان کی لطافت اور چاشنی اپنے عروج پر تھی۔ اس وقت کے قادر الکلام شعرا میں میرتقی میرؔ (وفات:1810)، سوداؔ (وفات:1718) ، خواجہ میر دردؔ (وفات:1784) انشا (وفات:1817)، مصحفیؔ (وفات: 1852)، ناسخ (وفات: 1838) آتشؔ (وفات:1847)، مومنؔ وفات:1852)، ذوق (وفات: 1854) اور غالبؔ (وفات:1869) کے نام اہم ہیں۔ یہ سبھی بنیادی طور سے غزل کے شعرا ہیں۔ مثنوی نگاری پر نظر ڈالیں تو میر حسن (وفات: 1786)، دیا شنکر نسیمؔ (وفات:1844) اور نواب مرزا شوق (وفات:1871) اعلیٰ مقام کے حامل ہیں۔ آگرہ میں بود وباش اختیار کرنے والے نظیر اکبر آبادی کو اردو کا عظیم عوامی شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ مرثیے کے میدان میں لکھنؤ کے انیس (وفات:1874) اور دبیر (وفات:1875) پر آج تک کوئی سبقت نہیں لے جاسکا ۔ غالبؔ جو کہ آخری مغل فرماں روا بہادر شاہ ظفر کے ہم عصر تھے، اُن کو کلاسیکی شعر ا کی کڑی کا آخری اور جدید شعرا کی کڑی کا پہلا شاعر تصور کیا جاتا ہے

ارد میں نثر کی شروعات اٹھارویں صدی میں ہوئی۔ غالبؔ کے خطوط نے جدید نثر کو معیار عطاکیے۔ بعد میں سر سید احمد خاں (وفات:1898)، محمد حسین آزاد (وفات: 1910)، حالیؔ (وفات:1914) اور شبلی (وفات: 1914) نے نثر نگاری کے میدان میں نمایاں رول ادا کیا۔ انیسویں صدی میں مختصر داستانوں مثلاً باغ وبہار (1802) اور رجب علی بیگ سرور کی داستان ‘فسانۂ عجائب’ (1831) نے ہزاروں صفحات اور متعدد جلدوں پر مشتمل طول طویل اور ضخیم داستانوں مثلاً طلسم ہوش ربا اور داستانِ امیر حمزہ (1881-1917) کی جگہ لے لی۔ نذیر احمد (وفات: 1912)، رتن

ناتھ سرشار (وفات: 1902) اور محمد ہادی رسوا (وفات: 1931) نے اردو میں ناول نگاری کی ابتدا کی۔ بیسویں صدی میں اردو ناول کو فروغ ملا۔ پریم چند (وفات: 1936) کے ناول ''گودان'' کو اردو میں کلاسک کا درجہ حاصل ہے۔ جدید کلاسیکی سرمایے میں سعادت حسن منٹو (وفات:1955) کے افسانے، قرۃ العین حیدر کا ناول ''آگ کاد ریا'' (1960) ، عبداللہ حسین کا ''اُداس نسلیں'' (1963)، راجندر سنگھ بیدی کا ''ایک چادر میلی سی'' (1962) اور انتظار حسین کا ناول ''بستی'' (1979) نمایاں اہمیت کے حامل ہیں۔

علامہ اقبال (وفات: 1938) کو بیسویں صدی کا سب سے عظیم شاعر ماناجاتا ہے۔ ن۔م۔ راشد (وفات: 1975) میراجی (وفات: 1949)، جوشؔ ملیح آبادی (وفات:1982)، فراقؔ گورکھ پوری (وفات:1982)، فیض احمد فیضؔ (وفات:1984)، مخدوم محیؔ الدین، (وفات:1969) اور اختر الایمان (وفات: 1996) وغیرہ اس دور کے اہم شعرا ہیں۔ اگر مضمون نگاروں، غیر افسانوی نثر نگاروں، ادبی ناقدین اور محققین پر نظر ڈالیں تو بابائے اردو مولوی عبد الحق (وفات:1961) ابوالکلام آزاد (وفات: 1958)، پطرس بخاری (وفات: 1958) محمود شیرانی (وفات: 1946)، شیخ محمد اکرام (وفات:1973)، سید محمد عبد اللہ (وفات:1986)، مسعود حسین رضوی ادیب (وفات:1975)، عابد حسین (وفات: 1978)، کلیم الدین احمد (وفات: 1983)، احتشام حسین (وفات: 1972)، محمد حسن عسکری (وفات: 1978)، امیتاز علی خان عرشی (وفات: 1981)، قاضی عبد الودد (وفات: 1984)، مالک رام (وفات: 1993)، کنہیا لال کپور (وفات: 1980) اور رشید احمد صدیقی (وفات: 1977) وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں

حصہ سوم

3

انیسویں صدی کا اردو ادب سیاسی اور تہذیبی تناظر میں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس دور میں اردو ادب نے نہ صرف معاشرتی تبدیلیوں کا عکس پیش کیا بلکہ سیاسی بیداری اور تہذیبی شعور کو بھی اُجاگر کیا۔ یہاں اس دور کے اردو ادب کے سیاسی اور تہذیبی پہلوؤں کی تفصیل دی جا رہی ہے۔

:سیاسی تناظر

1. 1857 کی جنگ آزادی:

انیسویں صدی کی سب سے بڑی سیاسی تبدیلی 1857 کی جنگ آزادی تھی۔ اس جنگ نے برطانوی راج کے خلاف ایک بڑے پیمانے پر بغاوت کو جنم دیا، جس کا اثر اردو ادب پر بھی واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اردو شعرا اور ادیبوں نے اس بغاوت کو اپنے کلام میں موضوع بنایا۔ اس دور کے ادبی شہ پاروں میں انقلابی جذبات اور آزادی کی تڑپ نمایاں ہیں۔

2. استعماریت اور نوآبادیاتی نظام :

برطانوی استعماریت نے ہندوستانی معاشرت کو نہایت حد تک متاثر کیا۔ اردو ادب نے اس استعماریت کی مخالفت میں اپنی جگہ بنائی۔ مرزا غالب، مولانا الطاف حسین حالی، اور دوسرے ادیبوں نے برطانوی ظلم و ستم اور اس کے اثرات کو اپنے ادبی کاموں میں بیان کیا۔ ان ادبی تخلیقات میں برطانوی حکومت کی پالیسیوں اور ان کے مسلمانوں پر پڑنے والے اثرات کی نشاندہی کی گئی۔

3. سرسید احمد خان اور علی گڑھ تحریک :

سرسید احمد خان کی علی گڑھ تحریک نے انیسویں صدی کے اردو ادب پر گہرا اثر ڈالا۔ سرسید نے مسلمانوں کو جدید تعلیم اور سائنسی علوم سے روشناس کرنے کی کوشش کی۔ ان کی تحریروں میں تعلیمی اور سماجی اصلاحات کے پیغام کو فروغ دیا گیا۔ علی گڑھ تحریک کے زیر اثر لکھے جانے والے ادب نے مسلمانوں میں تعلیمی اور سماجی بیداری پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

تہذیبی تناظر:

1. تہذیبی تغیرات اور اصلاحی تحریکات :

انیسویں صدی میں اردو ادب میں تہذیبی تغیرات کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ مولانا حالی، شبلی نعمانی، اور دیگر ادیبوں نے تہذیبی اصلاحات اور معاشرتی تبدیلیوں کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔ ان کے ادبی کاموں میں اخلاقی تعلیمات، مذہبی اصلاحات، اور سماجی انصاف کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا۔

2.انجمن پنجاب :

انجمن پنجاب ایک اہم ادبی تحریک تھی جس کا مقصد اردو زبان و ادب کو فروغ دینا تھا۔ اس انجمن کے تحت مختلف مشاعرے اور ادبی مباحثے منعقد کیے جاتے تھے، جس سے اردو ادب کی ترقی میں مدد ملی۔ انجمن کے تحت لکھنے والے ادیبوں نے سماجی مسائل، تہذیبی موضوعات، اور سیاسی حالات پر مبنی ادب تخلیق کیا۔

3.غزل اور شاعری

انیسویں صدی میں غزل اور شاعری نے تہذیبی اور سیاسی مسائل کو بیان کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ فراہم کیا۔ میرزا غالب، ذوق، اور دوسرے شعرا نے اپنے کلام میں معاشرتی اور تہذیبی موضوعات کو پیش کیا۔ ان کی شاعری میں محبت، فلسفہ، اور انسانی تجربات کے ساتھ ساتھ سیاسی حالات کا بھی ذکر ملتا ہے۔

نتیجہ:

انیسویں صدی کا اردو ادب سیاسی اور تہذیبی تناظر میں نہایت اہم دور تھا۔ اس دور کے ادبی شہ پارے نہ صرف اس وقت کی سیاسی جدوجہد اور تہذیبی تبدیلیوں کا عکس ہیں بلکہ آج بھی ان کی اہمیت برقرار ہے۔ انیسویں صدی کا اردو ادب ہمیں اس دور کی تاریخ، ثقافت، اور معاشرتی حالات کو سمجھنے میں مدد فراہم کرتا ہے اور اس دور کے ادیبوں کی کاوشوں کی قدر دانی کرتا ہے

. حصہ چہارم

4

بیسویں صدی میں اردو شعر وادب :-

پہلی جنگ آزادی کے بعد انیسویں صدی کے آخر تک ملک کی سیاس و سماجی تحریکوں کے بالواسطہ اثرات

اردو ادب میں بھی رونما ہونے لگے ۔جدی اردو شاعری کی کونپلیں اس وقت پھوٹنا شروع ہو ئیں جب کا شیرازہ بھرگیا ،اسے الہور منتقل کردیا گیا دلی کالج

۔ڈاکٹر الئٹنر اس کے پرنسپل بنائے گئے ۔انہوں نے خاص طور پرتعلیم اور معاشرتی اصالح کی جانب اشاعت مفید ہ پنجاب ''کی زیادہ توجہ دی۔21جنوری1865ء کو شکشا سدن کے مکان میں ''انجمن باقاعدہ طور پر بنیاد ڈالی ۔اس انجم کو ''انجم پنجاب ''کے نام سے بھی جانا جاتاہے ۔

انجم کا مقصد ادب کو ترقی دینا اور ادب برائے ادب کی جگہ ادب برائے زندگی کا نظریہ عام کرنا تھا

۔اس انجم کی بدولت غزل کی مقبولیت عام ہونے لگی کیونکہ غزل اپنی پرانی روایت سے نکل کر نئے مسائل پر کہی جانے لگی تھی ۔غزل کے ساتھ جدی نظم میں بھی سماجی مسائل کو شامل کیا جانے لگا ۔اس کی ترقی ،ترویج و اشاعت پر بھی زور دیا جانے لگا ۔اس مشن میں ڈاکٹر الئٹنر کے ہم نو ا پنڈت من بھول ،مولوی سید احمد دہلوی ،پیارے ال آشوبؔ ،درگا پرشاد

حالیؔ اور محمد حسین آزادؔ کے نام شامل ہیں ۔

آزاد نے اس انجم کی ترجمانی کے لئے ایک سہ ماہی رسالہ ''انجم اشاعت مفیدہ ''جاری کیا اور

ء میں انجم کے فروغ و اہتما کی خاطر مناظمہ یعن موضوعی مشاعرہ کی ابتد ء کی اور اپنے1867

لکچروں و شاعری سے لوگوں کو متوجہ کرنے کی کوش کی ۔اس ضمن میں آزادؔ کا یہ بیان بڑا ہی معنی خیز ہے :

ہمیں چاہئے کہ اپنی ضرورت کے بموج استعارہ ،تشبیہ اور اضافتوں کے اختصار فارسی سے لیں"

۔سادگیاظہار و اسالیب کو بھا شا سے سیکھیں لیکن پھر بھی قناعت جائز نہیں کیونکہ اب رنگ زمانہ کا کچھ اور ہے ۔ذرا آنکھیں کھولیں گے تو دیکھیں گے فصاحت و بالغت کا عجائب خانہ کھال ہے ۔''

اس زمانہ میں غزل کی اہمیت زیادہ تھی لیکن غزل نئے موضوعات سے دور اپنے پرانے رنگ و روایت

دور میں قید تھی ۔آزادؔ نے شاعری میں نئے مسائل و موضوعات داخل کرنے کی پہل کی ۔جس کا آغاز انہوں نے ایک جلسے کے اختتام پر اپنی نظم ''مثنوی شب قدر ''سنا کر کیا ۔اس نظم کو سنانے کا مقصد یہ تھا کہ اگر شاعر کچھ سلیقہ رکھتا ہے تو وہ ہر طرح کے مضامین اپنی شاعری میں شامل کر سکتا ہے : ۔کرنل ہالرائڈ نے مذکورہ نظم کی تعریف کرتے ہوئے لکھا

اس وقت مولوی محمد حسین صاحب نے جو مضمون پڑھا اور رات کی حالت پر اشعار سنائے وہ بہت تعریف کے قابل ہیں۔یہ نظم ایک عمدہ نمونہ اس طرز کا ہے جسکا رواج مطلوب ہے ''

انجم پنجاب نے نئی شاعری سے متعلق گیارہ موضوعی مشاعر ے منعقد کرائے ۔شعر اء میں حالی اور

آزادؔ کے نام بڑی اہمیت کے حامل ہیں ۔اگرچہ مارچ 1875ء میں موضوعی مشاعرے بند کر دئے گئے لیکن نئے انداز کی نظم نگاری کا سلسلہ فروغ پات رہا ۔

عبدالحلیم شر نے اپنے رسالہ ''دلگداز اور شیخ عبدالقادر نے ''مخزن ''کے ذریعہ اردو نظم میں نئے تجربا کئے

،حالی کا ادبی مزاج بدلنے میں بھی اس تحریک نے

اس انجم نے اردو شاعری کے عالوہ نثر کو بھی فروغ دیا ۔تحقیق وتنقید ادب میں وسعت پیدا کی ۔یو ں

ظاہر ہوتا ہے کہ انجم پنجاب کی تحریک دراصل ترقی پسند نظر یات کی حامل تھی ۔ادب پر اس کے اچھے اثرات ظاہر ہوئے ۔اس تحریک کی ابتد ء میں

محمد حسین آزاد نے کہا :

اب وہ زمانہ نہیں کہ ہم اپنے لڑکوں کو کہانی طوطا مینا کی زبانی سنائیں --۔اب کچھ اور وقت ہے ' ' اس واسطے ہمیں بھی کچھ کرنا چاہیئے ۔جو علوم وفنو کے عالوہ ایس تصنیفیں بھی چاہئیں جو صاف و شفا تقری پر رسوم و اخالق کی ہماری بزم کالم میں سجائیں ۔ان میں جو ہمارے داغ دھبے ہیں سب نظر ئیں

----قریب ہے کہ شائستہ زبانوں کی طرح ہماری زبان بھی جاں بخشی کی تاثیر پیدا کرے ---اورکتابوں سرسید نے تر اجم کے ذریعہ علمی خزانوں کو عام لوگوں کے میں کیا ہے جو ہماری زبان میں نہیں ۔ گھر وں تک پہنچای ۔علی گڈھ تحریک سے

نہ صرف اردو زبان کو وسعت حاصل ہوئی بلکہ اردو ادب کے اسالیب بیان اور روح معنی میں انقالب بھی پیدا ہوا

۔شبلیؒ نے سوانح اور اسالمی علوم پر جو کتابیں و مضامین لکھے وہ بالک نئے اور وقت کے تقاضوں کے مطابق تھے ۔مولوی نذیر احمد نے عورتوں کی بیدار و ان کی معاشرتی حالت بہتر بنانے کے لئے اصالحی و مسائلی ناول لکھے ۔

حالی نے جدید شاعری کے علاوہ تنقید و سوانح میں جو کام کیا وہ ادب میں ایک قیمت سرمایہ ہے ۔انہوں نے مقدمہ شعروشاعری کے ذریعہ تنقید کی رومیں اضافہ کیا ۔نواب محسن الملک نے مکالہ نگاری کی ابتداء کی ۔سرسید نے انگریز طرز پر مضمون لکھے ۔اس کے عالوہ زندگی اور اس کے تقاضوں کو قریب النیک کوش کی ۔نثر کو بوجھل پن سے پاک کیا ۔رنگی عبارت کی جگہ سادگی پیدا کی ۔مختریہ کہ سرسید اور ان کے رفقاء نے اردوزبان کو اس قابل بنادی کہ ہر قسم کے علمی ،ادبی ،فلسفیانہ ،تاریک و سماجی مضامین آسانی سے بیان کئے جا سکیں ۔

ان تحریکوں اور انجمنوں کے ذریعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بیسویں صدی میں اردو شاعری کا دامن بہت وسیع ہو گیا تھا ۔غزل ،رباعی ،قطعہ اور نظم وغیرہ نے اردو شاعری کو ماال مال کردیا تھا ۔قصیدہ ،مثنوی اور مرثیہ کی طرف البتہ کم توجہ دی گئی ۔اس صدی میں غزل و نظم میں زبردست تبدیلیاں آئیں

غزل ،جدی غزل

اور نئی غزل ،نظم ،جدی نظم ،نظم

معری ،نظم آزاد کی شکلیں بھی ابھر کر سامنے آئیں ۔اردو گیت کو بھی

فروغ ہوا ۔پیروڈ اور انگریز و جاپان کی بعض اصناف سخن جیسے سانیٹ اور ہائیکو بھی اردو شاعری میں داخل ہوئیں ۔

اردو غزل اور نظم کے ساتھ ادب کو بھی فروغ حاصل ہوا ۔بیسویں صدی کے آغاز سے ہی اردو ادب میں نمایا ں انقالب پیدا ہونے لگا تھا ۔

نظیر اکبر آبادی کی جس عوامی شاعر کو الئق اعتن نہ سمجھا گیا اب اسی

شاعری کی قدر ہونے لگی ۔ آزاد و حالی کے بعد عیلاسم میر ٹھی ،اکبر الہ آبادی ،چکبستؔ ، اقبال اور ظفر علی خاں وغیرہ نے نظم کو بلند مقا و مرتبہ بخشا ۔اس کے عالوہ ڈاکٹر اقبال سے نظم نگاری کو بہت عروج مال ۔بیسویں صدی میں مغربی میالنات کے ساتھ ساتھ فلسفہ اور سائن کا بھی گہرا اثر اردو نظم میں پای جات ہے۔ ۔ساتھ ہی موضوعاتِ شاعری کا دائرہ بھی اس صدی میں وسیع سے

وسیع تر ہوتا گیا

سیمابؔ اکبر آبادی ،جوش َملیح آبادی ،تلوک چند محرو،

حفیظ جالندھری ،جمیلؔ مظہری ،احسانؔ دانش،اثر لکھنوی،

اختر شیران اور اختر انصاری وغیرہ نے اردو نظم کو بڑی ترقی دی ۔یہاں کچھ شاعری اور

نظموں کا مطالعہ پیش ہے:

سیمابؔ کی نظموں میں سیاس رنگ اور وطنیت کا جذبہ ملتا ہے ۔کال م میں متان و سنجیدگ ہے ۔ان کی

شاعری میں فلسفہ ،حقائ اور محاکات نے زور و جوش پیدا کیا ۔چند اشعار پیش ہیں :

محبت میں اک ایس وقت بھی آتا ہے انساں پر ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے ِرگ جاں پر

رات آئی

پردہ تاریک پھیالت ہوئی جلوہ شام و شفق کے ساتھ اتراتی ہوئی

احسانؔ دانش

شاعر مزدور کی حیثیت سے مشہور ہیں ۔غریب اور ناداری کے تجربے نے انہیں اس غریب

مزدور طبقہ کی ترجمانی پر آمادہ کیا ۔بعض اشعار یہاں نمونے کے طور پر درج ہیں :

کہیں جھلسی ہوئی شاخیں ،کہیں بکسی ہوئی کلیاں تباہی ہے ،اسے حسنِ بہاروان کون کہتا

ہے

وامق جو نپوری کا نام ایسے ترقی پسند شاعروں میں لیا جات ہے جنہوں نے ترقی پسندوں کو ایمان بالغی کیطرح قبول کیا ۔

وامق نے جہاں ہنگامی موضوعات جیسے ''بھوکا بنگال ''،''اپنی تصویر سے''وغیرہ لکھیں

وہاں ''عید''،''نیال پرچم ''بھی پیش کس ۔یوسف

ظفر بنیاد طور پر نظم کے شاعرہیں ۔مثال مالحظہ ہو ۔

اب مرا عزم ہے فوالد کی مضبوط چٹان اب یہاں کانچ کی تلوار یں نہیں رہ سکتیں

اب میں خود آگ ہوں ہر شے کو جال سکتا ہوں مجھ سے اب ہاتھ اٹھ لو کہ میں جا سکتا ہوں

)زنداں)

یوسف ظفر نے مختلف عالمات واشارات کے ذریعہ اپنے مافی الضمیر کی ادائیگ کی بھر پور کوش کی

۔وہ اس میں کافی حد تک کا میاب بھی رہے ۔یوسف ظفرؔ کی طرح

ضیاء جالندھری نے بھی شاعری کی تما

ہئیتوں کو اپنے اظہار کا بنای ۔وہ اردو کی وراثت سے بخوبی واقف تھے ۔ان کے یہاں ،تشبیہا استعارا اور

تلمیحا کے ساتھ جدی عالمات بھی نظر آتے ہیں ۔

ضیاءؔ جالندھری زندگی کی لطافت کو نا پائیدار اور غم کو جاوداں سمجھتے ہیں کیونکہ ان کا تصور

حیات قنوطی ہے ۔ان کی شاعری میں غم کی تاریک کے ساتھ دردناک روشنی بھی پھوٹتی نظر آتی ہے ۔نظم

: آنسو‘‘ اس کا ایک بہترین نمونہ ہے "

سُنو سُنو ں

آنسو کی آواز سارے عالم پہ چھارہی ہے مگر میں کب سے ترس رہا ہوں

کہ میر پتھرائی خشک آنکھوں سے بھی کچھ آنسو ابھر تی لہروں کی طرح ابھریں

ترقی پسند تحریک کا مختصر جائزہ :- 1936میں

لکھنو میں انجم ترقی پسند مضفین کا

اجالس ہوا اور یہ طے پای گیا کہ ہندوستانی ادباء زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بے باکی سے اظہار

کریں ،سائن و عقلیت پسندی کو فروغ دیں اور اس قسم کے

انداز تنقید کا رواج بھی عام کریں جس سے مذہبی

،خاندانی ،جنسی رنگ اور سماج کے بارے میں رجعت پسندی اور ماضی پرستی کے خیاالت کی روک تھام کی

جا سکے ۔منشی

پریم چند ،جوشؔ ملیح آبادی،مجنو گورکھپوری،فراق گورکھپوری ،فیض احمد فیضؔ

،مجاز، لکھنوی ،کرشن چند ر ،جانثار،اختر،اختر رائے پوری سجاد ظہیر ،علی سردا جعفری

،جذبی ،سعادت حسن منٹو ،عصمت چغتائی ،راجند سنگھ بید ،سالم مچھلی شہری ،اور مخدو محی الدین وغیرہ شامل تھے۔عظیم

الحق جنید اس بابت یوں رقم طراز ہیں:

ترقی پسند شعراء اورمضفین نے سیاس انقالب کا مطلب یہ سمجھا کہ جاگیردار سرمایہ داری ، ‘ ‘
معاشی واقتص،ری

استحصال ،بھوک،افالس ومذہبی اجارہ داری کے خالف جنگ کی جائے ۔انہوں نے ایس تراکیب کو اس کا حل بتای اور اس کا پرچا کیا ’’۔۴ـہ

اس تحریک کے دوسرے شدت پسند علمبردارعلی سردا جعفری ہیں ۔نظم ’’نئی دنیا کو سالم ‘‘ان کی

صحی نمائیدگ کرتی ہے ۔ترقی پسندوں کی بھیڑ میں ن۔م۔ ّراشد اور میرا

جی دوا یسے شاعر ہیں ۔جنہوں نے

اردو شاعری کی عام مروجہ روایات سے انحراف کیا ۔اسر ر الحق

مجاز نے اس تحریک کے عروج میں سب

سے زیادہ مقبولیت حاصل کی ۔علی سردا جعفری ترقی پسند تحریک میں ایک افسانہ نگارکی حیثیت سے داخل

ہوئے لیکن جلد ہی شاعری کی طرف مائل ہوگئے ۔انکی نظموں میں انفرادیت کا رنگ جھلکتا ہے ۔سردا

جعفری نے آئے دن کے واقعات پر فوری قسم کی شاعری کی روایت ڈالی ۔ان کی نظموں میں ‘‘ ’’ٹوٹاہواستارہ

: آخری خط ‘‘،’’سال نو‘‘ خاص ہیں ۔نظم ’’ٹوٹا ہوا ستارہ ‘‘کے چند اشعار ’ ’ ،

آرہا ہے اک ستارہ آسماں سے ٹو کر دوڑتا اپنے جنوں کی راہ پر دیوانہ وار

اپنے دل کے

شعلہ سوزاں میں خود جلتا ہوا مختصر کرتا ہوا دامان ظلمت میں شرا

مجاز کی یہ نظم ’’پرواز‘‘ میں شائع ہوئی ۔اس مجموعہ کی بہت سی نظموں پر

جوش کا اثر پای جات ہے

۔بعد میں ان کا لہج مخصو ہو گیا اور اس لہج کی نظمیں ’’سیالب چین ‘‘،’’ں

آنسو کے چراغ ‘ ‘،’’موت

زنداں یہ زندا ‘‘اور ’’کوریا ‘‘ترقی پسند حلقوں میں کافی مشہور ہوئیں ۔ ’ ’،‘ ‘

اک طرف اونچے اونچے محل ہیں اک طرف جھونپڑے ہیں

اک طرف گوشت کے اور چربی کے بورے دھرے ہیں اک طرف سخت فوالد کے سخت اعصاب ہیں

اک طرف ظلم اور جبر کی قوتیں ہیں اک طرف عدل و انصاف کا زور ہے

اردو نظم کے فروغ میں ن۔م۔راشدؔ کی اہمیت سب سے زیادہ ہے ۔ ؔراشد ہندوستا کی سرزمین سے اٹھنے

والی بغاوت کی ایک نمائندہ آواز تھے ۔جس کی گونج ملک کے گوشے گوشے میں سنی گئی ۔انہوں نے
نظموں

:میں نئے نئے جہات کا پتہ لگای ۔نمونہ اشعار

جی میں آتا ہے لگا دوں ایک بے باکانہ جست

اس دریچے میں سے جو

جھانکت ہے ساتویں منزل سے کوئے بام کو (خودکشی)

اردو نظم نگاری میں ۔ن۔م۔ ؔراشد کی طرح معین احسن

جذبی کا مقا بھی اہم ہے ۔آپ نے فرمائشی نظمیں

لکھنی شروع کیں لیکن بہت جلد فرمائشی نظموں کو چھوڑ کر پھر اپنی ابتدائی نظموں کی طرح لطیف
اور دل

: کو چھولینے والی نظمیں لکھنے لگے ۔چند شاعروں کے چندشاعروں کے اشعار

اے کہ تم در غالمی کی دوا بھول گئے کھا کے ی

دل کی ہوا عہدِ وفا بھول گئے (معین)

احسن جذبی

رات بھر

دیدہ نمناک میں لہراتے رہے سان کی طرح آپ آتے جاتے رہے (مخدو محی الدین)

جانثار اخترؔ کی شاعری کا آغاز غزلوں اور ہلکی پھلکی نظموں سے ہوا لیکن وہ ترقی پسند تحریک
کے

: زیر اثر بہت جلد سیاس و سماجی حقائ کی طرف آگئے ۔نمونہ اشعار

یہ زمیں ہل جائیگ ،یہ آسمان ہل جائیگ اک نیا پرچم ہوا کے دوش پر لہرا ئیگا

(جانثار اختر)

میں اکیال ہی چال تھا جانب ِمنزل مگر لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا (مجروع)

سلطانپور

مذکورہ ترقی پسند شعراء کے عالوہ

ساحر لدھیانو ،اختر االیمان ،احمد

ندیم قاسمی ،سالمؔ مچھلی شہری اور شاد عارفی بھی اس تحریک میں شمار ہوتے ہیں ۔

نئی نظم : قدیم زمانہ میں شاعری غزل و نظم دو ر وپوں میں سامنے آئی ۔دونوں اصناف ایک دوسرے سے مختلف تھیں ۔اختصار ،ابہام اور رمزوایم کا غزل سے گہرا تعلق تھا اور نظم کا دائرہ محدو تھالیکن نئی نظم کسی عنوا کے تح ایک ہی خیال کی وضاحت کی جاتی ہے ۔موالن

حالی نے نظم کو نئی راہ دی ۔راشدؔ االیمان ،اختر اور فیض جیسے شاعروں نے موالن

حالی کے دکھائے راستے پر قدم بڑھائے ،

نظم میں نئے نئے تجربے کئے ۔ بیسویں صدی کے آغاز سے اردو شاعری میں ایک نئی روح ،نئی بیدار پیدا ہوئی ، نیا جوش اور نیا ولولہ پیدا ہوا ۔جدی مسائل بیان کرنے کے لئے اب نئے نئے الفاظ اور نئی نئی ترکیبوں کی ضرورت ہوئی

اور انداز بیان میں پیچیدگ آئی ۔زمانہ حال میں نظموں کا رواج عام ہوگیا ۔قومی ،سیاس

: ،سماجی ،ادبی ،مذہبی وتاریخ موضوعات پر نظمیں لکھی جانے لگیں ۔بقول سید اعجاز حسین

نئے رجحانات کا پیدا ہونا الزمی تھا اور ان کا قلمبند ہونا اس سے بھی زیادہ ضروری تھا ، نتیجہ ہوا ’’ کہ فنکاروں نے وقت کی نبض پر ہاتھ رکھ کر ملک کی ضرورت کا اندازہ کیا اور

حسب توفیق کے نسخے

تیارکئے جن میں حکیمانہ شعور بھی تھا اور مستقبل کی توانائی کا سامان بھی ‘‘۵۔

آخر کار نئی نظم کی شکل پرانی نظم سے بالک مختلف ہوگئی ۔پرانی نظم نثر کے قریب بھی اور نئی نظم

غزل کے ۔چونکہ نئی نظم کا شاعر بے باک ہے ،وہ جنسی مسائل پر بھی اپن قلم اٹھات ہے جس پر اسے عریان

اور فحاشی کا الزام لگای جات ہے ۔نئی نظم میں ردیف وقافیہ سے غرض نہ رکھ کر صرف آہنگ سے مطلب

رکھا جات ہے ۔آزادی کے بعد نئی نظم کے شاعروں کا ایک نیا گروہ سامنے آیا جس میں

ابن انشءَ ،افتخار ؔجالب

،عمیق حنفی ،بلراج

کومل ،شمس الرحمن فاروقی ،وحید اخترؔ

،زاہر زید ،فہمیدؔ ریاض ،عادلؔ منصوری

،پروینؔ شاکر ،شہریا

،خیل الرحمن اعظمی ،ساجدہؔ زید

،مصطفی زید ،سلیم الرحمن ،ساقیؔ فاروقی

،انیسؔ ناگی

،ضیاء جالندھری اور

شکیب نیاز کے نام خاص ہیں ۔

ہائیکو: ہائیکو ایک گیت کی صنف ہے ۔اس گیت کی نشو ونما جاپان میں ہوئی ۔دراصل ہائیکو مچھیروں کا

گیت ہے ۔یہ ایک بہت ہی پرانی صنف ہے بیسویں صدی میں اردو شاعری نے اس طر ف توجہ کی اور بہت

سے شاعروں نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ۔ہائیکو گیت محض تین مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے ۔اول

موضوع پھر دوسرے مصرع میں ایک خیال پیش کیا جات ہے اور آخر میں گیت کا نتیجہ بر آمد ہوتا ہے ۔نتیجہ

بھی ایس کہ جس کو سنکر انسا تعجب کے ساتھ غور وفکر کرنے پر مجبور ہو جائے ۔یہ بہت ہی مخصو و

مختصر صنف ہے ،اس کے باوجود اس کا ہر مصرع اپنی پوری بات کہ دیتا ہے ۔مثال کے طور پر
: نمونے یہاں پیش ہیں

پونچھے کون آنسو

ہیں بیحد مہنگے دامن

کیوں روتا ہے تو

کیسے تجھے پائیں

تجھکو ڈھونڈنے نکلیں تو

سوچیں تھک جائیں

تو خوب پھلے پھولے

غزل جدی : اردو شاعری میں غزل سب سے پرانی صنف ہے ۔اردو شاعری کی مختلف اصناف میں

جو مقبولیت غزل کو حاصل ہوئی وہ کسی اور صنف کو نصیب نہ ہوئی ۔اردو میں غزل کی بنیاد تو شمالی ہند

میں پڑی لیکن اسکی نشوونما دکن میں ہوئی ۔یوں غزل کو حسن و عشق اور محبت کی داستان کہا جات ہے

کیونکہ اس کا دائرہ محدو تھا لیکن غدر کے بعد غزل کی اس تنگ حالی کو محسو کیا گیا ۔بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی اس کا رنگ بدلنا شروع ہو گیا اور چند سالوں میں غزل کا نیا روپ سامنے آیا ۔

:اس بابت یقوب یاور لکھتے ہیں

سیاس و سماجی مسائل بھی غزلوں کا موضوع بننے لگے تھے ۔ترقی پسند شاعروں نے جس ’ ’
غزل کو سنوارا

،اس کی ابتدائی صورت گری کا نام ان کے پیش رو شعراء نے انجام دیا تھا ۔ ‘‘۶ے

دور جدی کے شاعر وں نے اپنی غزل کی بنیاد ’’دہلی اسکول‘‘کے طرز پر رکھی اور جدی غزل میں

مغربی ادب کے اثرات بھی داخل ہوئے ۔ادھر

حالی نے اصالح سخن کی تحریک شروع کی ۔ان کا مانن تھا کہ

غزل کو محض حسن و عشق کی داستان تک محدو نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اسمیں سیاس ،سماجی ،اخالقی اور

تہذیب مسائل پر بھی توجہ دی جانی چاہیئے ۔جدی غزل کی ترقی میں شادؔ عظیم آبادی اور عزیؔ لکھنوی کا اہم

رول ہے جدی غزل کی طرف خاص توجہ دی ۔انہوں نے کالم میں متان و شائستگی ،خیال میں وسعت ورفعت اور

اسلوب میں جدت کو دیگر خصائ پر مقدر رکھا ۔غزل جدی کے مشاہیر شعراء میں اصغرؔ

،حسرت ،جگر،فانی ،آزاد اور

فراق کے نام قابل ذکر ہیں ۔بعض شعراء کے منتخب اشعار یہاں ذیل میں پیش ہیں :

شادؔ عظیم آبادی :

مرغانِ چمن کو پھول ں نے اے شاد کہاں بھیجا ہے

آجاو جو تم کو آنا ہو ،ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

نئی غزل:

نئی غزل اور جدی غزل میں زیادہ فرق نہیں ہے محض لفظیات ہی کا فرق ہے ۔دونوں لفظوں کے

معنی ایک ہی ہیں ۔بیسویں صدی کی شاعری میں جو رجحانات شامل ہوئے اسے جدی غزل کا نام دیا گیا لیکن

تقسیم ہند کے بعد غزل میں نئی تبدیلیاں اور نئے مسائل ایک نئے روپ ورنگ میں داخل ہوئے اسلئے

اسکو ''نئی غزل''کہا گیا ۔اس نئی غزل میں پہلی تبدیل ماحول کی سخت گیر کے احسا کیساتھ پیدا ہوئی

۔چونکہ ہندوستا نے ایک طویل عرصہ غالمی میں گزار ا تھا اور اس دور کی خستہ حالی۔افالس ،تشنہ

وتکلیفیں اب بھی عوام و شعرا ء کے دلوں میں موج د تھیں ۔

نئی غزل میں صرف ماحول کی سخت گیر کا احسا ہی پیدا نہیں ہوا بلکہ ان سے نظریں چار کرکے ان

مسائل کا سامن کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا ۔شاعروں نے محسو کیا کہ سماج کی راہ نجات میں تبدیل النے کے

لئے نئے مسائل و نئے اجحانات کو اپن ناہوگ ۔اب غزل کے پیٹرن اور لب ولہج میں تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ نئی

نئی عالمتیں دریافت ہوئیں ،پیکر تراشی اور مصوری کا بول باال ہوا ۔اب غزل میں ہندی ،سنسکرت ،پنجابی

،اودھی ،پوربی ،سندھی وغیرہ زبانوں کے الفاظ بھی خوب استعمال ہونے لگے ۔

غزل میں اب نئی جمالیات اور نئی تراکیب برتی جانے لگیں ۔نظم کی طرح غزل بھی نئے تجربوں سے

گزررہی تھی ۔نئے نئے شعراء کے دخل اوران کے تجربوں نے غزل کا دائعرہ اور بھی وسیع کردیا۔ان شاعروں ، میں ، ناصر کا ظمی ،شہر ، یار ، وزیر ،آغا احمد ، ّفراز کمار ،پاشی ، ندا ،فاضلی ، سیم ّبریلو ، زیب غوری ، مظفرّ حنفی ، ظفر ،اقبال ، احسن علی ،خاں ، کیف بھوپالی،جانثار، اختر اورمعین احسن ،جذبی وغیرہ بہت مشہور

ہیں:

۔مذکورہ شعراء میں سے چند کا اشعار ذیل میندرج ہیں

ناصرکاظمی : رین اندھیر اور کنارہ دور چاند نکلے توپار اتر جائیں

وسیم بریلو: جہاں رہے گا وہیں روشنی لٹائیگ کسی چراغ کااپن مکاں نہیں ہوتا

ظفر اقبال میں ڈوبتا جزیرہ تھا موجوں کی مارپ چاروں طرف ہوا کاسمندر سیاہ تھا

ّاحمدفراز: تو خدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا دونوں انسا ہینتو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

گیت : اردو ادب میں گیت لکھنے کا رواج اسی وقت سے ہوا جب شاعری کا آغاز ہوا ۔اردو ادب میں گیت یوں تو ہندی ادب کے اثر سے داخل ہوا لیکن رفتہ رفتہ یہ اردو ادب کی پہچان بن گیا ۔ہندوستا میں گیتوں کی روایت بہت پرانی ہے۔نظم کی طرح گیت کو بھی کسی خاص موضوع سے نہیں باندھ جاسکت ۔گیت وہ صنف ہے جو موسیق سے تعلق رکھتی ہے اسی لئے یہ پڑھنے سے زیادہ سننے کی چیز بن جاتی ہے۔اس صنف میں کسی شخص کے جذبات یا دلی کیفیات کی سادگی اور بڑی بے تکلفی کے ساتھ پیش کیا جات ہے۔صوفیوں نے گیت کی اس روایت کو نیاروپ دیا ۔انہوں نے خدا کو معشوق اور خود کو اسکی سدا سہاگن تسلیم کرلیا۔وقت گزرنے کے ساتھ اردو گیت اس محدو دائرے سے باہر نکال چنانچہ معاشی ، سیاس و معاشرتی مسائل نے بھی گیتوں میں جگہ پائیگیت گھروں میں عورتوں کے ذریعہ ، ،واالدت ،چھٹی ،عقیقہ رت جگاہ و شادی وغیرہ مختلف تقریبوں اور تہواروں پر بھی گائے جاتے ہیناور ایسے گیت لوک گیت کے زمرے میں داخل ہیں ۔

اس متعلق یعقوب یاور یوں رقمطراز ہیں

ادبی طور پر اردو گیتوں کو بیسو صدی میں تسلیم کیا گیا ۔یہ وہ عہد تھا جب اردو کا ادبی ماحول ”

رومانیت کی گرفت میں تھا ۔اس لئے گیتوں میں رومانیت کا ہونا فطری تھا۔ ''۷ ـہ

بیسویں صدی میں اس صنف کو زیادہ فروغ حاصل ہوا ۔اردو میں سب سے قدیم اور مستند گیت وہ ہیں جو حضرت گنگوہی کی شادی کے موقع پر گائے گئے ۔میرا بائی کا نام بھی گیت کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے ۔ان کے گیتوں میں جدائی کا غم جھیل رہی عورت کے جذبات موجود ہیں۔نمونہ :

متوارے بادل آئے رے ہری کو سپنو کبھو نہ الئے رے

دوار مور پپیہا بولے کوئل سبد سنائے رے

کاری اندھیار بدری چمکے بڑھیں آئیں دریائے رے

کاری ناگ برہ اتی جاری میرا من ہری بھائے رے

دکن میں گیتوں کا کافی سرمایہ ملتا ہے۔قلی قطب ،شاہ اور عادل شاہ وغیرہ کے گیتوں میں خودسپردگی

،احسا کی شدّت ،درداورسوز ملتا ہے ۔اسی طرح شمال ہند میں

افضل کی بارہ ماسہ میں ہندوستانی فضا اور

مزاج کی عکاسی نمایاں ہے ۔صوفیائے کرام کے ہاں گیتوں کے نمونے ملتے ہیں

اردو میں گیت گوئی کا رواج بھی خاص قدیم ہے ۔ایس نظموں میں موضوعات کے محدو ہونے کے

وجود تشبیہا و استعارا کی ایک خوبصورت دنیا نظر آتی ہے :

نعت گوئی : ''نعت'' وہ نظم ہے جو رسول مقبول صلی ہللا علیہ وسلم کی شان میں کہی جاتی ہے۔بیشتر محققین

و ناقدی کا خیال ہے کہ حضرت خواجہ گیسودراز اردو کے پہلے نعت گو شاعر ہیں ۔یوں تو قریب قریب سبھی نے رسما یا تبرکا'' نعتیہ اشعار کہے ہیں ۔

سودا ،میر

مومن اور بعد کے شعراء نے بھی یہاں تک کہ غیرمسل

اردو شعراء نے بھی نعتیہ اشعار کہے ہیں ۔نعت کو صحی معنی میں محسن کاکوروی اور

امیر مینائی نے ادبی و فنی مقا عطا کیا۔موالن احمد رضا خاں بریلو کے عالوہ دوسرے

علماء اور صوفیا ء نے بھی نعت کو ،ادبی فنی و شرعی اعتبار سے بلند کیا۔اس بابت یعقوب یاور یوں رقمطراز ہیں:

اردو میں نعت گوئی کا رواج بھی خاص قدیم ہے ۔ایس نظموں میں موضوعات کے محدو ہونے کے ''

باوجود تشبیہا و استعارا کی ایک خوبصورت دنیا نظرآتی ہے۔ ''۸ـــہ

فن نعت گوئی میں حفیظؔ جالندھری کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ان کے ''شاہنام اسالم'' میں نعت پاک

کے بہت خوبصورت وہ پُر اثر نمونے موجود ہیں۔انہوں نے اپنی نعتوں میں داخلی جذبات کے ساتھ رسول خدا

صلی ہللا

: تعالی علیہ وسلم کے کماالت و فضائل کو بہت ہی نادر انداز میں بیان کیا ہے۔چند اشعر

محمد ﷺ کی محبت دین حق کی شرط اول ہے اسی میں ہواگر خامی تو سب کچھ نامکمل ہے

محمد ﷺ ہے متاع عالم ایجاد سے پیار ،پدر ،مادر ،براد جان و دل ،اوالد سے پیار

محمد کی غالمی ہے سند آزاد ہونے کی خدا کے دامن توحید میں آباد ہونے کی

محمد رسول ہللا صلی ہللا علیہ وسلم ہی اصل ہیں۔ ''یہ پیار نام اور اس کے الفاظ ، ان لفظوں کے '' زیر

وبم اور شاعری کی داخلی کیفیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔

'' اکبر میرٹھ نے بھی بہت سی نعتیں لکھیں ہیں ۔ان کے کئی مجموعے شائع ہوچکے ہیں ۔جنمیں

باغ کالم اکبر'' ، ''نہال روضہ اکبر''اور ''میالد

: اکبر'' بہت مشہور ہیں ۔ان کے نعتیہ کالم کے چند اشعار پیش ہیں

جنّت ملے کہ دوزخ کچھ ہم کو نہینموال راضی تری رضا ،میں خوش ہوں تری خوشی میں

براق آپ کا اک آن میں شب معراج کیا دعا کی روش آگیا کما ن کی طرح

اکبر کے عالوہ زائر حرم

حمید صدیق کا نام بھی نعتیہ شاعری میں خاص اہمیت رکھتا ہے ۔ان کے کالم کی

خصوصیات یہ ہیں کہ بحریں

عموما رواں و ،شگفتہ زبان سادہ ،وصاف مضامین غلو و غراق سے پاک اور کالم بہت ہی

: جاندار اوروجد آفریں ہے

خدا کا حریم جال ل آرہا ہے نگاہوں میں حسن و جمال آرہا ہے

پیش نظر ہے کون سی محفل نہ پوچھئے اظہار لطف دیدہے مشکل نہ پوچھئے

دل جانب مدینہ ہے رخ جانب حرم کچھ انتہائے کشمک دل نہ پوچھئے

کس کی تجلیاں ہیں تصور مینجلوہ گر آئینہ بن گیا ہے مرا دل نہ پوچھئے

معراج شوق ہو گر حاصل مجھے

حمید

اب مجھ سے میر زیست کا حاصل نہ پوچھئے

موالن احمد رضا خاں بریلو قدس سرہ العزی نامور عالم دین اور عظیم فقیہ و متقی ہونے کے باوصف

ایک بلند پایہ نعت گو شاعر بھی تھے-یوں تو ان کی لکھی ہوئی سبھی نعتیں بہت مقبول اور ادبی وفنی محاسن کا

: آئینہ دار ہیں لیکن خاص طور پر ان کے مشہور زمانہ سالم جسکا مطلع ہے

مصطفی جان رحمت پہ الکھوں سالم شمع بزم ہدایت پہ الکھوں سالم

۱مقاالت آزاد ،مرتبہ آغامحمد باقر ،مجلس ترقی ادب الہور ،ضرورت 1966 ص 50

۲ منشورات ،برج موہن دتاتر یہ کیف ،مرتبہ گوپی چند نارنگ ص 225

۳ نیرنگ خیال ،محمد حسین آزاد ،مکتبہ جامعہ دہلی 1978ء ص 15

۴ عظیم الحق جیند ،اردو ادب کی تاریخ مطبوعہ ایجو کیشنل بک س ہاو علی گڑھ 1978ء ص 159

۵ اردو ادب آزادی کے بعد :سید اعجاز حسن ص الف ایجوکیشنل بک ہاوس ،علی گڑھ2002

۶ یقوب یاور ''ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری ،ایجو کیشنل بک س ہاو علی گڑھ ص 266 2002

۷ ترقی پسند تحریک اورارد شاعری ''یعقوب ، یاور ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ2002ص329

۸ـہ یعقوب ،یاور ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری ص331، ایجوکیشنل بک ہاوس ،علی گڑھ2002

مولانا ابوالکلام آزاد ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی رہی

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

علامہ اقبال کے اس شعر کے مصداق بیسویں صدی کی دیدہ ور شخصیات میں مولانا آزاد کا شمار ہوتا ہے۔ مولانا آزاد 11 نومبر 1888ء میں مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے ۔ ان کا پورا نام محی الدین احمد تھا۔ آپ کے والد کا نام مولانا خیر الدین تھا۔ مولا نا خیر الدین کو 1857ء کے غدر کے بعد ہندوستان کو چھوڑنا پڑا۔ انہوں نے ایک لمبا عرصہ عرب و قطنطنیہ میں گزارا۔ اسی اثناء میں مولانا آزاد کی پیدائش ہوئی ۔ مولانا نے ابتدائی تعلیم نے فارسی اور عربی میں اپنے والد سے حاصل کی مولانا بچپن سے ہی کافی ذہین تھے۔ مولا جامعہ ازہر مصر سے بھی تعلیم حاصل کی انہیں دیگر زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا خصوصاً انگریزی اور فارسی - 12 سال کی عمر میں فارسی کی تعلیم مکمل کی اور عربی کی مبادیات سے واقف ہو گئے تھے اور پندرہ سال کی عمر میں دوسرے بچوں کو درس دینا شروع کر دیا تھا۔ مولانا آزاد نے دین اسلام کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ وہ بیک وقت انشاء پر داز ، جادو بیان خطیب، بے باک صحافی ، بہترین سیاست داں ہمفسر قرآن تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں میں انہوں نے حب الوطنی کے جذبہ کو فروغ دیا۔ مولانا آزاد کی شخصیت خواب

غفلت کی سیہ رات میں مثل شمع فروزاں کی تھی۔

اجمالی طور پر مولانا کی ہمہ جہت شخصیت مختلف پہلو کو یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

بحیثیت شاعر ۔ مولانا آزاد کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوتا ہے۔ اپنے ایک استاد کے مشورے پر انہوں نے آزاد تخلص اختیار کیا تھا اور یہ ان کے نام کا حصہ بن گیا۔ مولانا کی غزل پہلی بار حکیم عبد الحمید فرخ بمبئی کے گلدستہ ارمغان فرخ " میں شائع ہوئی تھی۔ جس کا طرح مصرعہ پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی " تھا۔ مولانا نے اپنے کلام کی اصلاح فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی اور امیر شعراء حضرت امیر مینائی سے لی 13 سال کی عمر میں مولانا نے ایک شعری گلدستہ نیرنگ عالم جاری کیا تھا۔ مولانا کم سنی میں ہی اچھی شاعری کرنے لگے تھے۔ لیکن وہ شعر شاعری تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ ادب کے مختلف میدانوں میں طبع آزمائی کی اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ مولانا آزاد کا کلام ملک کے معتبر رسائل، جرائد اور گلدستوں میں شائع ہوتا رہا۔ مولانا کی پہلی غزل کے اشعار

ملاحظہ ہو۔

نشتر بہ دل ہے آہ کسی سخت جان کی

نکلی صدا تو قصد کھلے گی زبان کی

گنبد ہے گرد بار تو ہے شامیانہ گرد

شرمند میری قبر نہیں سائبان کی

ہوں نرم دل کہ دوست کی مانند رو دیا

دشمن نے بھی جو اپنی مصیبت بیان کی آزاد بے خودی کے نشیب و فراز دیکھ پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

بحیثیت صحافی مولانا آزاد کو بچپن سے ہی صحافت و شاعری سے یکساں دلچسپی رہی اور ان کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری و صحافت سے ہوتا ہے مولانا تصنیف و تالیف کے اصولوں سے واقف تھے کم عمری میں ہی انہوں نے نیرنگ عالم جاری کیا تھا اس کے بعد المصباح اخبار نکالا - 1903ء میں انہوں نے " لسان الصدق" کے نام سے

ایک رسالہ جاری کیا جو آگے چل کر انجمن ترقی اردو کا ترجمان بنا - مولانا اپنے مضامین رسالہ مخزان کو بھیجا کرتے تھے بعد میں ان کا تعلق احسن الاخبار سے ہو گیا - 1903 ء مولانا خدنگ نظر کے مدیر بنے اور بعد میں مولا ناشبلی نعمانی نے انھیں الندوہ کا ایڈیٹر بنادیا۔ 1906ء میں مولانا وکیل اخبار کی ذمہ داری سنبھالی 1912ء کو الہلال" جاری کیا جوان کا اپنا ذاتی اخبار تھا - 1915ء میں " البلاغ " جاری کیا جو 1927 ء تک جاری رہا۔ مولانا آزاد نے اپنے اخبارات و رسائل بالخصوص الہلال اور البلاغ کے ذریعے ملک میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کا ناقابل فراموش کارنامہ انجام دیا تھا۔ دراصل یہ ایک انقلاب تھا جس کے ذریعے وہ قوم کے مذہبی و سیاسی اعتقادات میں انقلاب بر پا کرنا چاہتے تھے جس میں وہ کامیاب رہے۔

محمد رفیق ملک الہلال کی صحافتی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔ 1912 ء میں آپ نے کلکتہ سے ہفتہ وار اخبار الہلال جاری کیا جس میں

آزاد کا قلم پارہ آتش ثابت ہوا۔ الہلال کا وجود اردو صحافت میں ایک عظیم الشان انقلاب تھا اس نے اپنی زندگی کے تھوڑے ہی عرصے میں قوم کے مذہبی و سیاسی معتقدات میں انقلاب بر پا کر دیا اور اس کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی بھی بیش بہا خدمت انجام دی۔ الہلال کی انقلاب انگیز دعوت سے متاثر ہو کر مولانا محمودالحسن و اعتراف کرنا پڑا کہ " ہم سب اصلی

کام کو بھولے ہوئے تھے الہلال نے یاد دلایا اے

مولانا آزاد نے جنگ آزادی میں صحافت کو ذریعہ بنایا انگریزی حکومت کے خلاف لکھنا شروع کیا جس سے مسلمانوں میں انگریزی حکومت کے خلاف نفرت پیدا ہوئی ۔ مولانا سے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ ان کی زندگی کا ہر ساتواں دن جیل میں گزرا۔

بار ہا ان کے اخبارات پر پابندی لگائی گئی لیکن ہر بار وہ اپنے مقصد میں ثابت قدم رہے۔ بحیثیت ادیب۔ جس طرح مولانا آزاد نے صحافت کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کا عمدہ نمونہ پیش کیا اور صحافت کی بیش بہا خدمات انجام دی و ہیں انہوں نے ادب میں بھی اپنے کارناموں کا ڈنکا بجایا اور اپنی تصانیف سے ادبی خزانہ میں اضافہ کیا ہے۔ انہوں نے انا نیتی ادب اور انشائیہ نگاری کو اپنی مکتوبات سے سیراب کیا اور مکتوب نگاری میں اپنا امتیازی مقام بنایا ہے جس کی وجہہ سے ان کے مکاتیب اردو ادب کا بیش قیمتی اثاثہ ثابت ہوئے ہیں۔ مولانا آزاد کے خطوط کے کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں جن میں غبار خاطر ، کاروان خیال نقش آزاد تبرکات آزاد، مکاتیب آزاد قابل ذکر ہیں لیکن ان تمام خطوط کے مجموعوں میں غبار خاطر 1946 کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی ہے۔ غبار خاطر میں مولانا آزاد کے زمانہ قید احمد نگر جیل میں اپنے دوست مولانا حبیب الرحمن شروانی کے نام لکھے خطوط شامل ہیں ۔ یہ دراصل مولانا آزاد کے نجی خطوط تھے جس کو اجمل خاں (سکریٹری) کے اصرار پر مولانا نے اشاعت کی اجازت دی تھی۔ تذکرہ کے عنوان سے ۔ سے مولانا کی خود نوشت سوانح حیات ہے جس میں انہوں نے اسلاف کے کارناموں کو بیان کیا ہے۔

غبار خاطر سے مولانا آزاد کا شروانی صاحب سے مخاطبت کا انداز بیان دیکھیں۔ جانتا ہوں کہ میری صدائیں آپ تک نہیں پہنچ سکیں گی تاہم طبع نالہ سنج کو کیا کروں ، فریاد و شیون کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ آپ سن رہے ہوں یا نہ سن رہے ہوں۔ میرے ذوق مخاطبت کے لیے یہ خیال بس کرتا ہے کہ روئے سخن آپ کی طرف ہے ۔ غبارہ خاطر

بحیثیت سیاست داں ۔ مولانا آزاد کو ابتداء ہی سے سیاست سے دلچسپی تھی دو مذہب اور سیاست کو علحدہ نہیں سمجھتے تھے۔ مولانا آزاد گاندھی جی کی رہنمائی میں خلافت تحریک میں شامل ہو گئے اور بہت زیادہ جوش و جذ بہ کا مظاہرہ کیا اور اس تحریک کی کامیابی کیلئے جدو جہد کی اور اس تحریک کو آگے بڑھایا۔ مولانا نے کانگریس کی رکنیت حاصل کی 1939ء میں کانگریس کے قومی صدر منتخب ہوئے یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ مولانا سے قبل جتنے کانگریس کے صدور منتخب ہوئے ان سب میں مولانا سب سے کم عمر تھے۔ ہندوستان چھوڑ دو تحریک میں بھی مولانا نے حصہ لیا اور جیل کی صوبتیں برداشت کیں ۔ آزادی کی جدوجہد میں مولانا کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ مولانا ہندوستانی مسلمانوں کے بچے رہنماء تھے۔ مولانا نے مسلمانوں کی پاکستان منتقلی کی سخت مخالفت کی۔ آزادی ہند کی پہلی حکومت میں مولانا کو وزارت تعلیم کا عہدہ قبول کرنا پڑا اس عہدے پر

رہتے ہوئے 22 فروری 1958ء کو انتقال فرمایا۔

بحیثیت مذہبی رہنماء مولانا آزاد ایک جید عالم دین تھے۔ مولانا کی تقاریر

اور خطابت بہت مشہور تھی ، انہوں نے ترجمان القرآن کے عنوان سے قرآن مجید کی تفسیر لکھی ، جس کی انفرادیت نمایاں ہے جس میں ہمیں حکیمانہ و بلیغانہ نکات ملتے ہیں۔ ترجمان القرآن چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ انہوں نے دین اسلام کے پیغام کو عام کرنے کیلئے ترجمان القرآن، الصلوۃ، الزکوۃ ، الحج اور فقہ اسلامی جیسے موضوعات پر رسالے جاری کئے۔

عظیم الحق جنیدی مولانا آزاد کی خوبیوں سے متعلق لکھتے ہیں۔ مولانا آزاد کی ایک دوسری خوبی یہ ہے کہ ان کے مضامین میں قرآن کی آیات اور ان کا ترجمہ اس خوبی سے ان کی عام تحریروں میں آجاتا ہے کہ رقت کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ مقالات آزاد دو حصوں میں اور غبار خاطر جو 1942ء میں قلعہ احمد نگر جیل میں لکھے گئے خطوں کا مجموعہ ہے اردو انشائی ادب میں اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں ہے مولانا آزاد کی تصانیف کو اردو ادب میں غیر معمولی شہر ت حاصل ہوئی مولانا آزاد بیک وقت بلند پایہ انشا پر دار از جید عالم، مدبر، نامور سیاست دان بے باک صحافی اور

ایک مجاہد آزادی تھے ان کی شخصیت میں ہمہ جہت پہلوؤں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ تھا جوش و خروش

اتفاقی ساقی اب زندہ دلی کہاں سے باقی ساقی میخانے نے رنگ و روپ بدلا ایسا مے کش، مے کش رہا

(نہ ساقی ساقی (آزاد

ڈاکٹر سر علامہ محمد اقبال (ولادت: 9 نومبر 1877ء – وفات: 21 اپریل 1938ء) بیسویں صدی کے ایک معروف شاعر، مصنف، قانون دان، سیاستدان اور تحریک پاکستان کی اہم ترین شخصیات میں سے ایک تھے۔ اردو اور فارسی میں شاعری کرتے تھے اور یہی ان کی بنیادی وجہ شہرت ہے۔ شاعری میں بنیادی رجحان تصوف اور احیائے امت اسلام کی طرف تھا۔ علامہ اقبال کو دور جدید کا صوفی سمجھا جاتا ہے۔[حوالہ درکار] بحیثیت سیاست دان ان کا سب سے نمایاں کارنامہ نظریۂ پاکستان کی تشکیل ہے، جو انہوں نے 1930ء میں الہ آباد میں مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے پیش کیا تھا۔ یہی نظریہ بعد میں پاکستان کے قیام کی بنیاد بنا۔ اسی وجہ سے علامہ اقبال کو پاکستان کا نظریاتی باپ سمجھا جاتا ہے۔ گو کہ انہوں نے اس نئے ملک کے قیام کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا لیکن انہیں پاکستان کے قومی شاعر کی حیثیت حاصل ہے

ولادت:

اقبال 9 نومبر 1877ء (بمطابق 3 ذوالقعدہ 1294ھ)[20] کو برطانوی ہندوستان کے شہر سیالکوٹ میں شیخ نور محمد کے گھر پیدا ہوئے۔ ماں باپ نے نام محمد اقبال رکھا۔ مختلف تاریخ دانوں کے مابین علامہ کی تاریخ ولادت پر کچھ اختلافات رہے ہیں لیکن حکومت پاکستان سرکاری طور پر 9 نومبر 1877ء کو ہی اقبال کی تاریخ پیدائش تسلیم کرتی ہے۔

خاندان:

اقبال کے والد شیخ نور محمد، کشمیر کے سپرو برہمنوں کی نسل سے تھے۔ غازی اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں ان کے ایک جد امجد نے اسلام قبول کیا۔ اقبال کے آباء و اجداد اٹھارویں صدی کے آخر یا انیسویں صدی کے اوائل میں کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ آئے اور محلہ کھیتیاں میں آباد ہوئے۔ بزرگوں نے کشمیر چھوڑا تو سیالکوٹ میں آ بسے۔ شیخ نور محمد کے والد شیخ محمد رفیق نے محلہ کھٹیکاں میں ایک مکان آباد کیا۔ کشمیری لوئیوں اور دُھسّوں کی فروخت کا کاروبار شروع کیا۔ اقبال کے والد اور ان کے چھوٹے بھائی شیخ غلام محمد یہیں پیدا ہوئے، پلے بڑھے۔ بعد میں سہج رام سپرو بازار چوڑیگراں میں اُٹھ آئے جو اب اقبال بازار کہلاتا ہے۔ ایک چھوٹا سا مکان لے کر اس میں رہنے لگے اور مرتے دم تک یہیں رہے۔ اقبال کے دادا سہج رام سپرو کی وفات کے بعد شیخ نُور محمد نے اس سے ملحق ایک دو منزلہ مکان اور دو دکانیں خرید کر مکانیت کو بڑھا لیا۔

ابتدائی تعلیم:

شیخ نور محمد دیندار آدمی تھے۔ بیٹے کے لیے دینی تعلیم ہی کافی سمجھتے تھے۔ سیالکوٹ کے اکثر مقامی علما کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے۔ اقبال بسم اللہ کی عمر کو پہنچے تو انھیں مولانا غلام حسن کے پاس لے گئے۔ مولانا ابوعبد اللہ غلام حسن محلہ شوالہ کی مسجد میں درس دیا کرتے تھے۔ شیخ نُور محمد کا وہاں آنا جانا تھا۔ یہاں سے اقبال کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ حسبِ دستور قرآن شریف سے ابتدا ہوئی۔ تقریباً سال بھر تک یہ سلسلہ چلتا رہا کہ شہر کے ایک نامور عالم مولانا سید میر حسن ادھر آ نکلے۔ ایک بچّے کو بیٹھے دیکھا کہ صورت سے عظمت اور سعادت کی پہلی جوت چمکتی نظر آ رہی تھی۔ پوچھا کہ کس کا بچّہ ہے۔ معلوم ہوا تو وہاں سے اُٹھ کر شیخ نور محمد کی طرف چل پڑے۔ دونوں آپس میں قریبی واقف تھے۔ مولانا نے زور دے کر سمجھایا کہ اپنے بیٹے کو مدرسے تک محدود نہ رکھو۔ اس کے لیے جدید تعلیم بھی بہت ضروری ہے انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ اقبال کو ان کی تربیت میں دے دیا جائے۔ کچھ دن تک تو شیخ نور محمد کو پس و پیش رہا، مگر جب دوسری طرف سے اصرار بڑھتا چلا گیا تو اقبال کو میر حسن کے سپرد کر دیا۔ ان کا مکتب شیخ نور محمد کے گھر کے قریب ہی کوچہ میر حسام الدین میں تھا۔ یہاں اقبال نے اردو، فارسی اور عربی ادب پڑھنا شروع کیا۔ تین سال گذر گئے۔ اس دوران میں سید میر حسن نے اسکاچ مشن اسکول میں بھی پڑھانا شروع کر دیا۔ اقبال بھی وہیں داخل ہو گئے مگر پرانے معمولات اپنی جگہ رہے۔ اسکول سے آتے تو استاد کی خدمت میں پہنچ جاتے۔ میر حسن ان عظیم استادوں کی یادگار تھے جن کے لیے زندگی کا بس ایک مقصد ہوا کرتا تھا : پڑھنا اور پڑھانا۔ لیکن یہ پڑھنا اور پڑھانا نری کتاب خوانی کا نام نہیں۔ اس اچھے زمانے میں استاد مرشد ہوا کرتا تھا۔ میرحسن بھی یہی کیا کرتے تھے۔ تمام اسلامی علوم سے آگاہ تھے، جدید علوم پر بھی اچھی نظر تھی۔ اس کے علاوہ ادبیات، معقولات، لسانیات اور ریاضیات میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ شاگردوں کو پڑھاتے وقت ادبی رنگ اختیار کرتے تھے تاکہ علم فقط حافظے میں بند کر نہ رہ جائے بلکہ طرزِ احساس بن جائے۔ عربی، فارسی، اردو اور پنجابی کے ہزاروں شعر از بر تھے۔ ایک شعر کو کھولنا ہوتا تو بیسیوں مترادف اشعار سنا ڈالتے۔

مولانا کی تدریسی مصروفیات بہت زیادہ تھیں مگر مطالعے کا معمول قضا نہیں کرتے تھے۔ قرآن کے حافظ بھی تھے اور عاشق بھی۔ شاگردوں میں شاہ صاحب کہلاتے تھے۔ انسانی تعلق کا بہت پاس تھا۔ حد درجہ شفیق، سادہ، قانع، متین، منکسر المزاج اور خوش طبع بزرگ تھے۔ روزانہ کا معمول تھا کہ فجر کی نماز پڑھ کر قبرستان جاتے، عزیزوں اور دوستوں کی قبروں پر فاتحہ پڑھتے۔ فارغ ہوتے تو شاگردوں کو منتظر پاتے۔ واپسی کا راستہ سبق سننے اور دینے میں کٹ جاتا۔ یہ سلسلہ گھر پہنچ کر بھی جاری رہتا، یہاں تک کہ اسکول کو چل پڑتے۔ شاگرد ساتھ لگے رہتے۔ دن بھر اسکول میں پڑھاتے۔ شام کو شاگردوں کو لیے ہوئے گھر آتے، پھر رات تک درس چلتا رہتا۔ اقبال کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ خود وہ بھی استاد پر فدا تھے۔ اقبال کی شخصیت کی مجموعی تشکیل میں جو عناصر بنیادی طور پر کارفرما نظر آتے ہیں ان میں سے بیشتر شاہ صاحب کی صحبت اور تعلیم کا کرشمہ ہیں۔ سید میر حسن سر سید کے بڑے قائل تھے۔ علی گڑھ تحریک کو مسلمانوں کے لیے مفید سمجھتے تھے۔

ان کے زیر اثر اقبال کے دل میں بھی سرسید کی محبت پیدا ہو گئی جو بعض اختلافات کے باوجود آخر دم تک قائم رہی۔ مسلمانوں کی خیر خواہی کا جذبہ تو خیر اقبال کے گھر کی چیز تھی مگر میر حسن کی تربیت نے اس جذبے کو ایک علمی اور عملی سمت دی۔ اقبال سمجھ بوجھ اور ذہانت میں اپنے ہم عمر بچوں سے کہیں آگے تھے۔ بچپن ہی سے ان کے اندر وہ انہماک اور استغراق موجود تھا جو بڑے لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ مگر وہ کتاب کے کیڑے نہیں تھے۔ کتاب کی لت پڑ جائے تو آدمی محض ایک دماغی وجود بن جاتا ہے۔ زندگی اور اس کے بیچ فاصلہ پیدا ہوجاتا ہے۔ زندگی کے حقائق اور تجربات بس دماغ میں منجمد ہوکر رہ جاتے ہیں، خونِ گرم کا حصّہ نہیں بنتے۔ انہیں کھیل کود کا بھی شوق تھا۔ بچوں کی طرح شوخیاں بھی کرتے تھے۔ حاضر جواب بھی بہت تھے۔ شیخ نُور محمد یہ سب دیکھتے مگر منع نہ کرتے۔ جانتے تھے کہ اس طرح چیزوں کے ساتھ اپنائیت اور بے تکلفی پیدا ہوجاتی ہے جو بے حد ضروری اور مفید ہے۔ غرض اقبال کا بچپن ایک فطری کشادگی اور بے ساختگی کے ساتھ گذرا۔ قدرت نے انھیں صوفی باپ اور عالم استاد عطا کیا جس سے ان کا دل اور عقل یکسو ہو گئے، دونوں کا ہدف ایک ہو گیا۔ یہ جو اقبال کے یہاں حِس اور فِکر کی نادر یکجائی نظر آتی ہے اس کے پیچھے یہی چیز کارفرما ہے۔ باپ کے قلبی فیضان نے جن حقائق کو اجمالاً محسوس کروایا تھا استاد کی تعلیم سے تفصیلاً معلوم بھی ہو گئے۔ سولہ برس کی عمر میں اقبال نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ فرسٹ ڈویژن آئی اور تمغا اور وظیفہ ملا۔

اسکاچ مشن اسکول میں انٹرمیڈیٹ کی کلاسیں بھی شروع ہو چکی تھیں لہذا اقبال کو ایف اے کے لیے کہیں اور نہیں جانا پڑا، وہیں رہے، یہ وہ زمانہ ہے جب ان کی شاعری کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ یوں تو شعر و شاعری سے ان کی مناسبت بچپن ہی سے ظاہر تھی، کبھی کبھی خود بھی شعر موزوں کر لیا کرتے تھے مگر اس بارے میں سنجیدہ نہیں تھے، نہ کسی کو سناتے نہ محفوظ رکھتے۔ لکھتے اور پھاڑ کر پھینک دیتے۔ لیکن اب شعر گوئی ان کے لیے فقط ایک مشغلہ نہ رہی تھی بلکہ روح کا تقاضا

بن چکی تھی۔ اس وقت پورا برصغیر داغ کے نام سے گونج رہا تھا۔ خصوصاً اُردو زبان پر ان کی معجزانہ گرفت کا ہر کسی کو اعتراف تھا۔ اقبال کویہی گرفت درکار تھی۔ شاگردی کی درخواست لکھ بھیجی جو قبول کر لی گئی۔ مگر اصلاح کا یہ سلسلہ زیادہ دیر جاری نہ رہ سکا۔ داغ جگت استاد تھے۔ متحدہ ہندوستان میں اردو شاعری کے جتنے بھی رُوپ تھے، ان کی تراش خراش میں داغ کا قلم سب سے آگے تھا۔ لیکن یہ رنگ ان کے لیے بھی نیا تھا۔ گو اس وقت تک اقبال کے کلام کی امتیازی خصوصیت ظاہر نہ ہوئی تھی مگر داغ اپنی بے مثال بصیرت سے بھانپ گئے کہ اس ہیرے کو تراشا نہیں جا سکتا۔ یہ کہہ کر فارغ کر دیا کہ اصلاح کی گنجائش نہ ہونے کے برابر ہے۔ مگر اقبال اس مختصر سی شاگردی پر بھی ہمیشہ نازاں رہے۔ کچھ یہی حال داغ کا بھی رہا۔

اعلیٰ تعلیم :

مئی 1893ء میں اقبال نے میٹرک کیا اور 1895ء میں اقبال نے ایف اے کیا اور مزید تعلیم کے لیے 6 لاہور آ گئے۔ یہاں گورنمنٹ کالج میں بی اے کی کلاس میں داخلہ لیا اور ہاسٹل میں رہنے لگے۔ اپنے لیے انگریزی، فلسفہ اور عربی کے مضامین منتخب کیے۔ انگریزی اور فلسفہ گورنمنٹ کالج میں پڑھتے اور عربی پڑھنے اورینٹل کالج جاتے جہاں مولانا فیض الحسن سہارنپوری ایسے بے مثال استاد تشریف رکھتے تھے۔ اس وقت تک اورینٹل کالج لاہور، گورنمنٹ کالج ہی کی عمارت کے ایک حصّے میں قائم تھا اور دونوں کالجوں کے درمیان میں بعض مضامین کے سلسلے میں باہمی تعاون اور اشتراک کا سلسلہ جاری تھا۔

1898ء میں اقبال نے بی اے پاس کیا اور ایم اے (فلسفہ) میں داخلہ لے لیا۔ یہاں پروفیسر ٹی ڈبلیوآرنلڈ کا تعلق میسّر آیا۔ جنھوں نے آگے چل کر اقبال کی علمی اور فکری زندگی کا ایک حتمی رُخ متعین کر دیا۔

مارچ 1899ء میں ایم اے کا امتحان دیا اور پنجاب بھر میں اوّل آئے۔ اس دوران میں شاعری کا سلسلہ بھی چلتا رہا، مگر مشاعروں میں نہ جاتے تھے۔ نومبر 1899ء کی ایک شام کچھ بے تکلف ہم جماعت انھیں حکیم امین الدین کے مکان پر ایک محفلِ مشاعرہ میں کھینچ لے گئے۔ بڑے بڑے سکّہ بند اساتذہ، شاگردوں کی ایک کثیر تعداد سمیت شریک تھے۔ سُننے والوں کا بھی ایک ہجوم تھا۔ اقبال چونکہ بالکل نئے تھے، اس لیے ان کا نام مبتدیوں کے دور میں پُکارا گیا۔ غزل پڑھنی شروع کی، جب اس شعر پر پہنچے کہ :

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے

قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تو اچھے اچھے استاد اُچھل پڑے۔ بے اختیار ہو کر داد دینے لگے۔ یہاں سے اقبال کی بحیثیت شاعر شہرت کا آغاز ہوا۔ مشاعروں میں باصرار بُلائے جانے لگے۔ اسی زمانے میں انجمن حمایتِ اسلام سے تعلق پیدا ہوا جو آخر تک قائم رہا۔ اس کے ملّی اور رفاہی جلسوں میں اپنا کلام سناتے اور لوگوں میں ایک سماں باندھ دیتے۔ اقبال کی مقبولیت نے انجمن کے بہت سارے کاموں کو آسان کر دیا۔ کم از کم پنجاب کے مسلمانوں میں سماجی سطح پر دینی وحدت کا شعور پیدا ہونا شروع ہو گیا جس میں اقبال کی شاعری نے بنیادی کردار ادا کیا۔

ایم اے پاس کرنے کے بعد اقبال 13 مئی 1899ء کو اورینٹل کالج میں میکلوڈ عربک ریڈر کی حیثیت سے متعین ہو گئے۔ اسی سال آرنلڈ بھی عارضی طور پر کالج کے قائم مقام پرنسپل مقرر ہوئے۔ اقبال تقریباً چار سال تک اورینٹل کالج میں رہے۔ البتہ بیچ میں چھ ماہ کی رخصت لے کر گورنمنٹ کالج میں انگریزی پڑھائی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے کینیڈا یا امریکا جانا چاہتے تھے مگر آرنلڈ کے کہنے پر اس مقصد کے لیے انگلستان اور جرمنی کا انتخاب کیا۔ 1904ء کو آرنلڈ جب انگلستان واپس چلے گئے تو اقبال نے ان کی دوری کو بے حد محسوس کیا۔ دل کہتا تھا کہ اُڑ کر انگلستان پہنچ جائیں۔ اورینٹل کالج میں اپنے چار سالہ دورِ تدریس میں اقبال نے اسٹبس کی ''ارلی پلائنجنٹس''اور واکر کی ''پولٹیکل اکانومی'' کا اردو میں تلخیص و ترجمہ کیا، شیخ عبد الکریم الجیلی کے نظریۂ توحیدِ مطلق پر انگریزی میں ایک مقالہ لکھا اور ''علم الاقتصاد'' کے نام سے اردو زبان میں ایک مختصر سی کتاب تصنیف کی جو 1904ء میں شائع ہوئی۔ اردو میں اپنے موضوع پر یہ اولین کتابوں میں سے ہے۔

اورینٹل کالج میں بطور عربی ریڈر مدت ملازمت ختم ہو گئی تو 1903ء میں اسسٹنٹ پروفیسر انگریزی کی حیثیت سے اقبال گورنمنٹ کالج میں تقرر ہو گیا۔ بعد میں فلسفے کے شعبے میں چلے گئے۔ وہاں پڑھاتے رہے یہاں تک کہ یکم اکتوبر 1905ء کو یورپ جانے کے لیے تین سال کی رخصت لی۔

مزید تعلیم اور سفر یورپ :

25 دسمبر 1905ء کو علامہ اقبال اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے اور کیمبرج یونیورسٹی ٹرنٹی کالج میں داخلہ لے لیا۔ چونکہ کالج میں ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے لیے گئے تھے اس لیے ان کے لیے عام طالب علموں کی طرح ہوسٹل میں رہنے کی پابندی نہ تھی۔ قیام کا بندوبست کالج سے باہر کیا۔ ابھی یہاں آئے ہوئے ایک مہینے سے کچھ اوپر ہوا تھا کہ بیرسٹری کے لیے لنکنز اِن میں داخلہ لے لیا۔ اور پروفیسر براؤن جیسے فاضل اساتذہ سے رہنمائی حاصل کی۔ بعد میں آپ جرمنی چلے گئے جہاں میونخ یونیورسٹی سے آپ نے فلسفہ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

سر عبد القادر بھی یہیں تھے۔ اسی زمانے میں کیمبرج کے استادوں میں وائٹ ہیڈ، میگ ٹیگرٹ، وارڈ، براؤن اور نکلسن جیسی نادرۂ روزگار اور شہرۂ آفاق ہستیاں بھی شامل تھیں۔ میگ ٹیگرٹ اور نکلسن کے ساتھ اقبال کا قریبی ربط ضبط تھا بلکہ نکلسن کے ساتھ تو برابر کی دوستی اور بے تکلفی پیدا ہو گئی۔ البتہ میگ ٹیگرٹ کی جلالت علمی کے ساتھ ان کی عمر بھی تھی، وہ اقبال سے خاصے بڑے تھے جب کہ نکلسن کے ساتھ سن کا کوئی ایسا تفاوت نہ تھا۔

میگ ٹیگرٹ ٹرنٹی کالج میں کانٹ اور ہیگل کا فلسفہ پڑھاتے تھے۔ خود بھی انگلستان کے بڑے فلسفیوں میں گِنے جاتے تھے۔ براؤن اور نکلسن عربی اور فارسی زبانوں کے ماہر تھے۔ آگے چل کر نکلسن نے اقبال کی فارسی مثنوی "اسرار خودی" کا انگریزی ترجمہ بھی کیا جو اگرچہ اقبال کو پوری طرح پسند نہیں آیا مگر اس کی وجہ سے انگریزی خواں یورپ کے شعری اور فکری حلقوں میں اقبال کے نام اور کام کا جزوی سا تعارف ضرور ہو گیا۔ انگلستان سے آنے بعد بھی اقبال کی میگ ٹیگرٹ اور نکلسن سے خط کتابت جاری رہی۔

آرنلڈ جو کیمبرج میں نہیں تھے، لندن یونیورسٹی میں عربی پڑھاتے تھے، لیکن اقبال بڑی باقاعدگی سے ان سے ملنے جایا کرتے تھے۔ ہر معاملے میں ان کا مشورہ لے کر ہی کوئی قدم اُٹھاتے۔ انہی کے کہنے پر میونخ یونیورسٹی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے رجسٹریشن کروایا۔ کیمبرج سے بی اے کرنے کے بعد جولائی 1907ء کو ہائیڈل برگ چلے گئے تاکہ جرمن زبان سیکھ کر میونخ یونیورسٹی میں اپنے تحقیقی مقالے کے بارے میں اس زبانی امتحان کی تیاری ہو جائے جو اسی زبان میں ہوتا تھا۔ یہاں چار ماہ گزارے۔ "ایران میں ما بعد الطبیعیات کا ارتقا" کے عنوان سے اپنا تحقیقی مقالہ پہلے ہی داخل کرچکے تھے، ایک زبانی امتحان کا مرحلہ ابھی رہتا تھا، اس سے بھی سرخروئی کے ساتھ گذر گئے۔ 4 نومبر 1907ء کو میونخ یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری دے دی۔ 1908ء میں یہ مقالہ پہلی بار لندن سے شائع ہوا۔ انتساب آرنلڈ کے نام تھا۔

ڈاکٹریٹ ملتے ہی لندن واپس چلے آئے۔ بیرسٹری کے فائنل امتحانوں کی تیاری شروع کردی۔ کچھ مہینے بعد سارے امتحان مکمل ہو گئے۔ جولائی 1908ء کو نتیجہ نکلا۔ کامیاب قرار دیے گئے۔ اس کے بعد انگلستان میں مزید نہیں رُکے، وطن واپس آ گئے۔

لندن میں قیام کے دوران میں اقبال نے مختلف موضوعات پر لیکچروں کا ایک سلسلہ بھی شروع کیا، مثلاً اسلامی تصوّف، مسلمانوں کا اثر تہذیب یورپ پر، اسلامی جمہوریت، اسلام اور عقلِ انسانی وغیرہ بدقسمتی سے ان میں ایک کا بھی کوئی ریکارڈ نہیں ملتا۔

ایک مرتبہ آرنلڈ لمبی رخصت پر گئے تو اقبال ان کی جگہ پر لندن یونیورسٹی میں چند ماہ کے لیے عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔

مئی 1908ء میں جب لندن میں آل انڈیا مسلم لیگ کی برٹش کمیٹی کا افتتاح ہوا تو ایک اجلاس میں سیّد امیر علی کمیٹی کے صدر چُنے گئے اور اقبال کو مجلسِ عاملہ کا رُکن نامزد کیا گیا۔

اسی زمانے میں انھوں نے شاعری ترک کردینے کی ٹھان لی تھی، مگر آرنلڈ اور اپنے قریبی دوست شیخ عبد القادر کے کہنے پر یہ ارادہ چھوڑ دیا۔ فارسی میں شعر گوئی کی ابتدا بھی اسی دور میں ہوئی۔

قیامِ یورپ کے دوران میں اقبال کے دو بنیادی خیالات تبدیل ہونے شروع ہوئے۔ اقبال وطنی قومیّت اور وحدتِ الوجود کی طرف میلان رکھتے تھے۔ اب وہ میلان گریز میں بدلنے لگا تھا۔ خاص طور پر وطنی قومیت کے نظریے کے تو اس قدر خلاف ہو گئے جسے نفرت کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔

یورپ پہنچ کر انھیں مغربی تہذیب و تمدّن اور اس کی روح میں کارفرما مختلف تصوّرات کو براہ راست دیکھنے کا موقع ملا۔ مغرب سے مرعوب تو خیر وہ کبھی نہیں رہے تھے، نہ یورپ جانے سے پہلے نہ وہاں پہنچنے کے بعد۔ بلکہ مغرب کے فکری، معاشی، سیاسی اور نفسیاتی غلبے سے آنکھیں چرائے بغیر انھوں نے عالمی تناظر میں امتِ مسلمہ کے گذشتہ عروج کی بازیافت کے لیے ایک وسیع دائرے میں سوچنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ان پر مغربی فکر اور تہذیب کا چھپا ہوا بودا پن منکشف ہو گیا۔

جولائی 1908ء میں وطن کے لیے روانہ ہوئے۔ بمبئی سے ہوتے ہوئے 25 جولائی 1908ء کی رات دہلی پہنچے

بیعت و ارادت :

ڈاکٹر جاوید اقبال نے زندہ ورود" میں لکھا۔۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نور محمد سلطان العارفین حضرت قاضی سلطان محمود دربار آوان شریف کے مرید تھے جو سلسلہ قادریہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی بنا پر اقبال بھی بچپن سے سلسلہ قادریہ میں بیعت کیے ہوئے تھے

بیسویں صدی کے عشرہ اول میں پنجاب کی مسلم آبادی ایک ٹھہراؤ میں مبتلا تھی۔ کہنے کو مسلمانوں کے اندر دو سیاسی دھڑے موجود تھے مگر دونوں مسلمانوں کے حقیقی تہذیبی، سیاسی اور معاشی مسائل سے بیگانہ تھے۔ ان میں سے ایک کی قیادت سر محمد شفیع کے ہاتھ میں تھی اور دوسرا سر فضل حسین بھی اپنے اپنے حمایتیوں کو لے کر پہنچے، طے پایا کہ پنجاب میں صوبائی مسلم لیگ قائم کی جائے۔ اس فیصلے پر فوری عمل ہوا۔ میاں شاہ دین صدر بنائے گئے اور سر محمد شفیع سیکرٹری جنرل۔ سر فضل حسین عملاً الگ تھلگ رہے۔ اقبال ان سب قائدین کے ساتھ دوستانہ مراسم تو رکھتے تھے مگر عملی سیاست سے انھوں نے خود کو غیر وابستہ ہی رکھا۔

1911ء تک متحدہ ہندوستان کے اکثر مسلمان قائدین، سرسید کے حسب فرمان، انگریزی حکومت کی وفاداری کا دم بھرتے رہے، لیکن 1911ء اور 1912ء کے بیچ کے عرصے میں حالات جو ایک ڈھرّے پر چلے جا رہے تھے، اچانک پلٹا کھا گئے۔ مسلمان سیاست دان بنگال کی تقسیم کے حق میں تھے، انگریز بھی ایسا ہی چاہتے تھے، مگر ہندو اس منصوبے کے سخت مخالف تھے۔ ان کی جانب سے تشدّد کی راہ اختیار کی گئی تو انگریزی حکومت نے سپر ڈال دی۔ تقسیم بنگال کو منسوخ کر دیا گیا۔ اس جھٹکے نے مسلمان قائدین کی آنکھیں کھول دیں اور ان کے گذشتہ اندازِ فکری کی غلطی ان پر واضح ہو گئی۔ انھیں اب آکر احساس ہوا کہ اپنی قومی اور سیاسی زندگی کے تحفظ کے لیے صرف سرکار کی وفاداری پر کمر بستہ رہنا یا انگریزوں کے بنائے ہوئے آئینی ذرائع اختیار کیے رکھنا ناکافی اور بے معنی ہے۔ بقول مولانا شبلی نعمانی تقسیم بنگال کی تنسیخ مسلمانوں کے چہرے پر ایک ایسا تھپّڑ مارنے کے مترادف تھی، جس نے ان کے منہ کا رُخ پھیر کر رکھ دیا۔

تقسیم بنگال کی منسوخی کا اعلان ہوا تو یکم فروری، 1912ء کو موچی دروازہ لاہور میں مسلمانوں نے ایک احتجاجی جلسہ منعقد کیا، جس میں اقبال بھی شریک ہوئے۔ مقررین نے بڑی جذباتی اور جوشیلی تقریریں کیں۔ اقبال کی باری آئی تو مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کا مینار بن کر اُٹھے اور فرمایا:
’’مسلمانوں کو اپنی ترقی کے لیے خود ہاتھ پاؤں مارنے چاہیئں۔ ہندوؤں کو اب تک جو کچھ ملا ہے، محض اپنی کوششوں سے ملا ہے۔ اسلام کی تاریخ دیکھو وہ کیا کہتی ہے۔ عرب کے خطّے کو یورپین معماروں نے ردّی اور بیکار پتھر کا خطاب دے کر یہ کہہ دیا تھا کہ اس پتھر پر کوئی بنیاد کھڑی نہیں ہو سکتی۔ ایشیا اور یورپ کی قومیں عرب سے نفرت کرتی تھیں مگر عربوں نے جب ہوش سنبھالا اور اپنے کس بل سے کام لیا تو یہی پتھر دنیا کے ایوانِ تمدن کی محراب کی کلید بن گیا اور خدا قسم ! روما جیسی باجبروت سلطنت عربوں کے سیلاب کے آگے نہ ٹھہر سکی، یہ اس قوم کی حالت ہے جو اپنے بَل پر کھڑی ہوئی۔! ‘‘

تصانیف :

دا ریکنسٹرکشن آف ریلیجس تھاٹ ان اسلام" کے نام سے انگریزی میں ایک نثری کتاب بھی تحریر " کی۔

مزید دیکھیے: آثار اقبال

صرف اولین اشاعتوں کے سن دیے گئے ہیں۔

کُلیّاتِ اِقبال

نثر

علم الاقتصاد – 1903ء

فارسی شاعری

اسرار خودی – 1915ء

رموز بے خودی – 1917ء

پیام مشرق – 1923ء

زبور عجم – 1917ء

جاوید نامہ – 1932ء

مسافر – 1936ء

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق – 1931ء

اُردو شاعری

مہدف مقالہ: اردو شاعری

[بانگ درا – 1924ء[23

[بال جبریل – 1934ء[24

[ضرب کلیم – 1936ء[25

فارسی +اُردو شاعری

[ارمغان حجاز – 1938ء[26

انگریزی تصانیف

فارس میں ماوراء الطبیعیات کا ارتقاء – 1908ء

اسلام میں مذہبی افکار کی تعمیر نو – 1930ء

وفات

علامہ محمد اقبال 21 اپریل 1938ء بمطابق 20، صفر المصفر 1357ء کو فجر کے وقت اپنے گھر جاوید منزل میں طویل علالت کے باعث خالق حقیقی سے جا ملے اور ان کو لاہور میں بادشاہی مسجد کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔

حصہ پنجم

5

اکیسویں صدی میں اردو زبان کی عالمگیر مقبولیت :

اردو زبان دنیا کی چند بڑی اور ترقی یافتہ زبانوں میں ایک ہے۔ اس میں دوسری زبانوں حیت اور روایت بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس مزاج نے اسے اور تہذیبوں کو جذب کرے ہ تک دفاتر کی واحد زبان بنی رہی اور فی زمانہ عوامی زبان بنایا اور بر صغیر ہند و پاکہ بطے کی زبان بن گئی ہے۔ ڈاکٹر اجے مالوی دنیا کے تقریبا ہر بڑے شہر میں انگریزی کے خیالات یہاں بڑے ہی کارآ ادب میں تلاش و جستجو کے ضمن میں جو

باتیں لکھی ہیں، اس کا تعلق اردو کی مقبولیت سے وابستہ ہے۔ وہ رقم طراز ہیں : ہندوستان کی تمام زبانیں مختلف لسانی تبدیلیوں کے ساتھ دسویں صدی میں وجود میں آئیں لیکن ویدک ادب میں استعمال کردہ لفظ اردو ، امن اور ماورائے دماغ متواتر اکیسویں صدی تک ہو بہو استعمال ہو رہے ہیں اور اردو کی یہ مقدس دیدی اصطلاح اکیسویں صدی کے عالمی قومی اور مقامی پس منظر میں یہ حقیقی معنوں میں بین الاقوامی محبوبیت اور مقبولیت کی امین ہو گئی ہے۔ آج پوری دنیا سمٹ کر عالمی گاؤں میں تبدیل ہو چکی ہے اور مشتر کہ ہندوستانی تہذیب کا ا ہے اور خورشید نشان اردو عالمی گاؤں کا جاگتا جگمگاتا ہوا عالمی نشان امتیاز بن چکا ہے۔ ویدک ادب اور اردو ص ۸۴)

آج دنیا کے تقریبا تمام ملکوں میں اردو ایک اہم زبان کی حیثیت سے پڑھائی جارہی ہے۔ برطانیہ تو اردو کے سواد اعظم سے باہر اردو کا تیسرا سب سے بڑا مرکز ہے اور وہاں کی تقریبا تمام یونیورسٹیوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے۔ اردو کے متعدد اخبارات اور رسائل بھی شائع ہوتے ہیں اور درجنوں انجمنیں کام کر رہی ہیں۔ اسکول آف اور نیشنل افریقن اسٹڈیز اردو کی اعلیٰ تعلیم اور

تحقیقات کا مرکز ہے۔ امریکہ سے بھی اردو کے متعدد اخبارات و رسائل نکلتے ہیں اور کتا بیں شائع ہوتی ہیں ۔ وہاں کی اکثر یو نیورسٹیوں میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے۔ کینیڈا کی کئی یونیورسٹیوں میں بھی اردو کی تعلیم کا بندو بست ہے جہاں سے کہتا میں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں ، اخبارات و رسائل بھی نکلتے ہیں اور ٹورنٹو یونیورسٹی کے علاوہ دیگر یونیورسٹیوں میں اردو تعلیم کا نظم ہے۔ یہاں کی مونٹریل یو نیورسٹی میں اقبال چیئر قائم ہے۔ جاپان، چین ، جنوبی افریقہ ، ناروے، پراگ، برلن اور سابقہ سویت یونین ممالک میں بھی اردو زبان پڑھائی جاتی ہے اور اس کے بولنے والوں کی اچھی

تعداد موجود ہے۔ ماریشس میں اردو تیسری زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ استنبول یونیورسٹی میں باضابطہ اردو کا شعبہ ہے اور یہاں اکثر اردو کے پروگرام ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ رنگون ، سنگا پور اور ہانگ کانگ میں بھی رابطے کی زبان کے طور سے اردو رائج ہے اور وہاں سے اردو اخبارات و رسائل بھی شائع ہو رہے ہیں۔ عرب ممالک بشمول مصر اور خلیج کے بہت سے علاقے

نیز ایران کی متعدد یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبے قائم ہیں۔

برصغیر ہند و پاک ، بنگلہ دیش اور نیپال کے کروڑوں لوگوں کی مادری زبان اردو ہے۔

سرکاری سطح پر دیکھا جائے تو پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہے۔ ہندوستان میں اردو کوریاست جموں و کشمیر میں پہلی سرکاری زبان جب کہ بہار، اتر پردیش، تلنگانہ، مغربی بنگال اور دہلی ریاستوں میں دوسری سرکاری زبان مہاراشٹر، کرنا تک اور آندھرا پردیش وغیرہ ریاستوں میں اردو داں طبقہ کثیر تعداد میں رہائش پذیر ہے۔ چنانچہ برصغیر میں اپذیر ہے۔ چنانچہ برصغیر میں اردو را بطے کی سب سے بڑی اور موثر زبان کی حیثیت رکھتی ہے نیز مذہب اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں عربی کے علاوہ اگر کسی زبان نے اہم رول ادا کیا ہے تو وہ اردو ہی ہے۔ اس زبان میں اسلامی لٹریچر کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ تفسیر ، شرع حدیث ، فقہ وسیرت کے علاوہ دیگر تمام علوم وفنون میں بھی اردو زبان میں بہترین کتابیں موجود ہیں۔ ایک دوسری اہم حقیقت یہ بھی ہے کہ اس وقت برصغیر کے مسلمانوں کی ایک اچھی تعد اور وزگار کے سلسلے میں عرب کے مختلف ممالک میں پھیلی ہوئی ہے جن کی مادری زبان اردو ہے۔ عرب اقوام جو اس وقت بہت تیزی کے ساتھ ترقی کی راہ پر گامزن ہیں اور دنیا کی تیسری

طاقت بلکہ موجودہ سیاسی صورت حال کے پیش نظر دوسری بڑی طاقت کے طور پر دیکھی جارہی ہیں، ان کے لئے اردو جیسی اہم اور ترقی یافتہ زبان سے گہری دلچسپی اور واقفیت وقت کی ضرورت ہے۔ اردو اپنے رسم الخط میں اور اپنی قواعد اور لغت میں عربی سے قریبی اشتراک رکھتی ہے۔ اور اردو بولنے والے عربی زبان رغبت سے سیکھتے ہیں کیوں کہ یہ قرآن پاک اور حدیث کی زبان ہے۔ ساتھ ہی ملک عرب اور وہاں کے باشندوں کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ لہذا لنے والوں کی داعی اسلام اور پاسبان حرم کی حیثیت سے عربوں کو چاہئے کہ وہ اردو زبان کو ایک غیر ملکی زبان کی حیثیت سے سیکھیں اور پڑھیں جس طرح وہ انگریزی اور فرنیچ وغیرہ سیکھتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں عرب کے باشندوں اور اردو جاننے والوں کے درمیان رابطہ قوی ہوگا اور عالمی

اسلامی اتحاد کی راہ میں یہ ایک مفید اور اہم قدم ہو گا ساتھ ہی اردو داں آبادی کے درمیان اسلامی عقیدہ اور دین کی اشاعت کا کام اہل عرب براہ راست کر سکیں گے

چونکہ زبانیں معاشرتی تہذیب کی ورثہ دار ہوتی ہیں۔ اس لئے بھی مربوط اور بہتر تعلقات کے استوار کرنے میں زبان کی مہارت اور واقفیت عالمی پیمانے پر مانی جاتی ہے۔ مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں اردو زبان کی بین الاقوامی حیثیت مسلم ہو جاتی ہے۔ جدید بین الملی سیاسی ثقافتی، تجارتی اور اقتصادی تحولات کی روشنی میں اور اس کے ساتھ ساتھ عرب ممالک کے دنیا سے تجارتی تعلقات کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر ایشیا میں پائیدار، پر امن اور ترقی پذیر ماحول قائم رکھنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ ایشیائی ممالک کے درمیان ان کی مقبول عام زبانوں کی واقفیت کا منصوبہ بندلین دین ہوتا رہے۔ اس لئے زبان عالمی برادری اور بھائی چارہ قائم کرنے میں ایک ست بڑا ذخیرہ قوی محرک ہو سکتی ہے۔ اسے بھی ایک اہم جواز کی حیثیت سے پیش کیا جاسکتا ہے۔ اردو کی عالمگیریت میں ایک بڑا کردار اطلاعاتی تکنالوجی بھی ادا کر رہی ہے۔

انٹرنیٹ

نوں کی ایک

میں بہترین کے وسیلے سے کمپیوٹر اور موبائل فون نے ایک انقلاب لا دیا ہے۔ دنیا دن بہ دن ملتی جارہی ہے۔ چند سطور کا ایس ایم ایس ہو، یا آڈیو/ ویڈیو سے مزین ایم ایم ایس یا بھاری بھر کم فائلوں پر مشتمل ای میل سکنڈوں میں دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں پہنچ جانا اب ایک عام سی بات

زبان کے ہے اور قواعد کی پابندیوں سے آزاد جملوں کی بھر مار او مختصر سے پیرائے میں اپنی بات کو سموتے ہوئے ایک نئی زبان ایجاد ہو رہی ہے اور اسے پسند کیا جا رہا ہے ۔ اس لئے زبان پر جتنی زیاد و قدرت حاصل ہوگی اتنی زیادہ مہارت سے اظہار کا وسیلہ بہتر طریقہ سے سامنے آئے گا

اس لئے اکیسویں صدی میں زبان کی اہمیت اور بھی زیادہ ہوگئی ہے۔

انٹرنیٹ پر نشر اور شاعری کے بے شمار نمونے روز دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اگر زبان کی اہمیت

اکیسویں صدی میں کم ہو جاتی تو ابن انشاء کی طرح اردو کی آخری کتاب لکھنا پڑتا لیکن اوراق Font اگر اسکرین بن جائیں

اوراگر ٹائپنگ میں قلم کا رول ادا کریں تو اس سے یہ سمجھ لینا کہ اکیسویں زبان میں بھی معلومات کا ذخیرہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ دنیا کے سب سے بڑے سرچ انجن گوگل پر اردو میں تلاش کرنے کے بہت سے متبادل دیگر بین اقوامی زبانوں کی طرح ہی دستیاب ہیں ۔ اس طرح مشہور آن لائن انسائیکلو پیڈیا " وکی پیڈیا پر اردو میں بھی مطلوبہ موادل جاتا ہے۔ ساتھ ہی اس میں ترمیم و اضافہ کی گنجائش بھی موجود ہے۔ سی این این اور بی بی سی جیسی دنیا کی بڑی خبر رساں

صدی میں کتابوں رسالوں اور زبانوں کی اہمیت گھٹ گئی ہے تنگ نظری ہے۔ کیونکہ زمانہ کی تبدیلی شعبۂ حیات کے ہر پہلو پر اثر انداز ہوتی ہے اور جدید تر ٹکنالوجی کے بڑھتے سیلاب نے اس بھرم کو دور کر دیا ہے کہ زبان اور اس کے ادب کا مطالعہ ہرلمحہ کیا جا سکتا ہے۔ اب تو روز کا تازہ

اخبار ایک کی جگہ چار بہ آسانی انٹرنیٹ کے اسکرین پر پڑھا جاتا ہے۔ ان میں ہر پل ہونے والی تبدیلیوں سے آگاہی ہوتی ہے۔ اردو یونی کوڈ فونٹ کی ایجاد نے اردو میں ویب سائٹس اور ایپس کی تیاری میں بڑی مدد کی ہے۔ اب ماؤس کی ایک کلک سے یا موبائل کے ایک بٹن کو دبا کر اپنی

ایجنسیوں کے اردو ویب سائٹس معتبر اور مستند خبروں سے ہمہ وقت بھرے رہتے ہیں۔ فیس بک ، ٹوئٹر ، انشا گرام اور دیگر مقبول عام سوشل میڈیا پلیٹ فارمس پر اسی یونی کوڈ تکنالوجی نے اردو لکھنے میں مدد پہنچائی ہے۔ یوٹیوب پر اردو سیکھنے سکھانے کے متعلق بہت سے ویڈیو روزانہ اپ لوڈ کئے جاتے ہیں۔

اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کے بعد یہ رفتار اور تیز ہوگئی ہے لیکن روایت پسند حضرات

اسے دوسرے زاویوں سے دیکھ رہے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اردو جاننے والے ، پڑھنے والے، لکھنے والے کم ہوتے جا رہے ہیں حالانکہ ایسی بات نہیں ہے۔ اب ترسیل و ابلاغ کے لئے ذرائع کی سہولت کے بعد زبان میں اور بھی ترقی ہوئی ہے۔ نئے نئے الفاظ کا اضافہ ہوا ہے۔ نئے نئے طریقہ اظہار کے تجربے ہو رہے ہیں۔ اردو زبان میں یہ مکالمے، یہ خبریں یہ سیریل ، یہ کہانیاں، ٹی وی اور کمپیوٹر کے ذریعہ ہم لوگوں تک پہنچ رہے ہیں ۔ یہ زبان کا عروج نہیں تو اور کیا ہے؟ مارکونی نے ریڈیو ویب کے ذریعہ زبان کو مالا مال کیا تھا اور کچھ عرصہ قبل تک دور دراز علاقوں میں جہاں بجلی اور دیگر سہولیات نہیں تھیں اور رابطے کئے ہوئے تھے وہاں ابلاغ کا زبردست ذریعہ ٹرانزسٹر ہوا کرتے تھے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس سے اخبار کی اہمیت گھٹ گئی تھی یا پرنٹ میڈ یا ختم ہو گیا تھا۔ ڈرامے، شاعری ، افسانے ، سب ریڈیو سے براڈ کاسٹ ہونے لگے تھے اور اردو زبان وہاں تک پہنچنے لگی تھی جہاں تصور کام نہیں کرتا تھا۔ ریڈیو سے اس کا دائرہ وسیع ہوا۔ سیلولائٹ نے

بھی اردو کے فروغ میں اہم رول ادا کیا اور اکیسویں صدی میں ٹی وی اور انٹرنیٹ نے اردو کو اور بھی مزین کرنے کا کام کیا_

ہندوستانی فلموں نے اردو زبان کے فروغ میں جو کردار ادا کیا ، اس کی اہمیت وافادیت کا

انداز و صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس موضوع پر اب تک بے شمار سیمینار منعقد ہو چکے ہیں اور کئی یو نیورسٹیوں میں پی ایچ ڈی کے مقالے بھی قلم بند کئے جاچکے ہیں۔ راقم الحروف کی کنوینر شپ میں مارچ ۲۰۱۱ء میں دربھنگہ (بہار) میں یکروزہ ہندوستانی فلمیں اور اردو کا کامیاب انعقاد قومی اردو کونسل کے تعاون سے ہوا تھا جس کی ادبی حلقوں میں بے حد پذیرائی ہوئی تھی۔ اس سیمینار میں پیش کئے گئے مقالوں پر بنی ایک ضخیم اور وقیع کتاب ۲۰۱۲ ء میں منظر عام پر آچکی ہے جس سے ریسرچ اسکالروں اور طالب علموں کو اس موضوع پر کام کرنے میں بہت سہولت ہوگئی ہے۔ ٹیلی ویژن پر اردو کیبل چینلز بھی اب عام ہوتے جارہے ہیں جن پر ۲۴ گھنٹے پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ ان پروگراموں میں فلمیں ، سیریل ، مشاعرے، اہم ادبا و شعراء پر دستاویزی فلمیں ، ڈرامے اور اردو تہذیب و ثقافت سے متعلق پروگرام شامل ہیں۔ ای ٹی وی.

اردو چینل کا ۱۵ اگست ۲۰۰۱ ء میں آغاز ہوا جو ہندوستان میں غالبا پہلا غیر سرکاری اردو چینل ہے جس کے روح رواں جناب را موجی راؤ ہیں ۔ اردو زبان کے فروغ و اشاعت میں موصوف اور ان کے ٹی وی چینل کی خدمات نا قابل فراموش ہیں ۔ ۲۰۰۸ ، تک اس چینل پر آؤاردو سیکھیں نامی ایک پروگرام نشر کیا جاتا تھا جس کے میزبان پروفیسر مظفر شہ میری ہوا کرتے تھے۔ اس

پروگرام کے ذریعہ عالمی سطح پر لاکھوں افراد نے اردو لکھنا، پڑھنا سیکھا۔ اکیسویں صدی میں زبان کے عروج کے بہت سارے اسباب ہیں۔ پہلے زبان کے لئے ادبی کاوشیں ہی موثر ذریعہ تھیں جن سے لوگ اپنے آپ کو اظہار کے قابل سمجھتے تھے لیکن اب تو ہر شعبہ حیات میں زبان کی ضرورت ہے۔ اگر کھیل کا میدان ہے تو اس کی رنگ کامنٹری کے لئے بھی زبان کا سہارا لینا ہے۔ زبان کی ضرورت بڑھی اور اس کا دائرہ بھی بڑھا اور لوگ زبان کو مزید چست درست بنانے میں لگے رہے اور دنیا کی زبانوں سے اختلاط کا موقع اردو زبان کو اور زیادہ ملا اور اس کے ذخیرہ الفاظ میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ زبان ایسی اہل ہو گئی کہ یہ اپنے تقاضوں کو اور ضرورتوں کو پیش کرنے میں کہیں بھی اور کسی صورت بھی کم نہیں رہی۔ اس لئے اکیسویں صدی زبان کے عروج کی اہم وجہ ہے۔

بیسویں صدی میں بالخصوص ہندوستان میں پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کی کوششوں سے بہت ساری اکیڈمیز کا قیام عمل میں آیا اور ہندوستان کے مختلف فنون لطیفہ کو مزید زندگی بخشی اور ان کے تحفظ کے لئے اس طرح کے ادارے قائم کئے۔ ساہتیہ اکیڈمی نے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ادبی کاوشوں کو محفوظ کرنے کا کام کیا اور بیسویں صدی کی آخری دہائی اور اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں عمدہ ادب کا ذخیرہ دیا۔ اس ذخیرہ میں اردو زبان کا بھی ایک بڑا حصہ ہے۔ بیسویں صدی میں ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں اردوا کاڈ میاں قائم کی گئیں ۔ یہ اکاڈمیاں بیسویں صدی میں بہت زیادہ فعال نہیں تھیں لیکن اکیسویں صدی میں ان کی فعالیت میں اضافہ ہوا ہے اور اپنی حدود میں رہ کر یہا کا دمیاں قلم کاروں کو کتابوں کی اشاعت کیلئے مالی تعاون ، کتابوں پر انعامات ، نادار اور بزرگ قلم کاروں کو وظائف وغیرہ سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ غیر سرکاری

اداروں میں غالب انسٹی ٹیوٹ اور غالب اکاڈمی جیسے ادارے فعال ہیں ۔ ان اکادمیوں کے علاوہ انجمن ترقی اردو ہند اور اس کی بعض ریاستی شاخوں نے بھی اپنے کام کو رفتار دی ہے اور اس کے زیرنگرانی اشاعتی کام تیزی سے ہوئے ہیں۔ درمیان میں فنڈ اور حالات کی ناسازگاری کے سبب انجمن کی سرگرمیاں کسی حد تک تعطل کا شکار ہوگئی تھیں مگر اب انجمن اپنی اشاعتی سرگرمیوں اور

خوبصورت ویب سائٹ کے ساتھ پھر سے اردو کی ترویج واشاعت میں سرگرم عمل ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے بھی دور دراز علاقوں تک اردو کی ترسیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ کونسل تقریبا دو دہائیوں سے مختلف اسکولوں، کالجوں اور اردو اداروں میں کمپیوٹر کی فراہمی کر کے اردو زبان میں کمپیوٹر ٹر ینگ کورس کا اہتمام کرتی آرہی ہے جس کے ذریعہ آج لاکھوں اردو داں طالب علم اپنی مادری زبان میں کمپیوٹر سکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ کونسل نے دوسری زبانوں کی اہم کتابوں کے ترجمے بھی بحسن و خوبی کرائے ہیں۔ گاڑی پر کتابوں کی فروخت کا سلسلہ قائم کر کے اردو کتابوں کو کونسل نے ایسی دور دراز اردو بستیوں تک پہنچایا ہے جہاں کے لوگوں کے لئے کتابوں کی خرید آسان نہیں تھی۔ اردو قلم کاروں کی کتابوں کی تھوک خریداری اور اشاعت پر مالی تعاون کے ذریعہ کونسل نے بڑا کام کیا ہے۔ کونسل کے اس وقت کے ڈائریکٹر کی میعاد کار کے دوران تیسری عالمی اردو کا نفرنس بھی ہوئی جس کا شاندار انعقاد پچھلی دو کانفرنسوں کی کامیابی کی دلیل ہے۔ قومی اردو کونسل کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ ای۔ کتاب جو دنیا کا پہلا مفت ای پب ہے جسے ڈاؤن لوڈ کر کے کونسل کی مطبوعہ کتابوں کا مطالعہ کوئی بھی کر سکتا ہے۔ یہ ایپ اردو کے مقبول ترین خط نستعلیق میں اینڈروائڈ موبائل نیز کمپیوٹرس و لیپ ٹاپ پر اردو برقی کتابیں پڑھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس ایپ کا اجراء ۲۴ مارچ ۲۰۱۸ء کو پانچویں عالمی اردو کا نفرنس کے دوران دہلی کے ہوٹل دی اشوک میں ہوا۔ ہندوستان میں لسانی ادارے اور اردو میڈیم سے تعلیم دینے کے لئے جس شدومد کے ساتھ اکیسویں صدی میں کام ہوا ہے اس سے پہلے ایسی کاوش دیکھنے کو نہیں ملتی۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے قیام سے اردو زبان کے گیسو سنوارنے کا ہی کام نہیں کیا گیا بلکہ ادب کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی اردو میں کتا بیں فراہم

ایک بڑا کام انجام دیا گیا اس سے اردو آبادی اکیسویں صدی میں فیضیاب ہو رہی ہے۔ ی کے موجود و بادی قیات میں نیروی ترقی کے بے مہارت سے کر رہی ہے۔ اردو زریعہ تعلیم کے درجنوں روایتی اور فاصلاتی کورسز کے ذریعہ یو نیورسی اردو داں طبقے کی اپنی

مادری زبان میں اعلی تعلیم حاصل کرنے کے خواب کو شرمندہ تعبیر کر رہی ہے۔ سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کے علاوہ بہت سی ویب سائٹس بھی اردو زبان وادب کے فروغ کا کام بڑے پیمانے پر کر رہی ہیں جن میں ریختہ ڈاٹ او آر جی سرفہرست ہے۔ ایک محب اردو جناب سنجیو صراف کی قیادت میں ریختہ کی ویب سائٹ پر ہزاروں اردو کتابوں کو ڈیجیٹائز کر دیا گیا ہے جس سے دنیا بھر کی بڑی لائبریریوں میں موجود نادر و نایاب اردو کتابیں ڈیسک ٹاپ یا لیب اور موبائل میں ایپ کے ذریعہ قارئین کو دستیاب ہو گئی ہیں، جن سے خصوصی طور پر ریسرچ اسکالرز بھر پور فائدہ حاصل کر رہے ہیں۔ غیر اردو داں طبقہ کو اس زبان کی شیر ینیت کا احساس دلانے کے لیے ہر سال اس ویب سائٹ کے زیر اہتمام جشن ریختہ کا انعقاد بڑے پیمانے پر کیا جاتا ہے۔ ایم قمر علیگ نے اپنی تحریر بعنوان " اردو زبان کی زبوں حالی کا المیہ مطبوعہ روزنامہ راشٹریہ سہارا کولکا تا مرقومہ ۱۶ فروری ۲۰۱۸ ء میں اس

پیاری زبان کی بقا پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

خاموشی کے ساتھ جو لوگ اردو کی ارتقا کے لئے کام کر رہے ہیں، وہ قابل مبارک باد ہیں، لہذا امید " کی جاسکتی ہے اردو کی نشاۃ ثانیہ اب بہت زیادہ دور

نہیں ہے اور وہ اپنی روایتی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہونے والی ہے۔ غیر مسلم ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے ذریعہ اردو کی ترقی و ترویج کے لئے جو کارہائے نمایاں انجام دئے جارہے ہیں وہ بھی اردو کے تابناک مستقبل کی عکاسی کرتے ہیں۔ ذات پات یا مذہب کی بنیاد پر کوئی بھی زبان کسی دوسری بان سے کمتر نہیں ہوتی ہے۔ یہ صرف کچھ لوگوں کے سوچنے کا غیر مناسب نظریہ ہے۔ سوشل میڈیا کے توسط سے آج اردو کو جس طرح سے فروغ مل رہا

ہے وہی اس بات کی ضمانت ہے کہ زبا نہیں خود نہیں مرتیں بلکہ انہیں مارا جاتا ہے اور ہم میں سے ہی کچھ لوگ ان کو برقرار رکھنے کے لئے سامنے آجاتے ہیں ۔ مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ

اردو اپنی شیرینی ، لطافت اور پرزور انداز میں متاثر کرنے کی صلاحیت کی بنا پر اکیسویں صدی میں یقینی طور پر مزید وسعت اختیار کرے گی اور دلوں کو جوڑنے میں پر جوش عمل دکھلائے گی ۔ اردو نے قومی یکجہتی اور اتحاد سے بھی اپنی شناخت کو منور کیا ہے۔ یہ ایک زندہ زبان کی علامت ہے جس سے افادیت اور مقصدیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اردو زبان اظہار کا بہترین مرقع ہے جس میں معنی و مفہوم کی گیرائی و گہرائی ملتی ہے۔ اکیسویں صدی میں معاشرہ کے بطون میں داخل ہو کر اردو جذ بہ کی تسکین کا ذریعہ بنے گی اور پیوستگی کے چہرے کو صحت مند کرے گی

فورٹ ولیم کالج کے اہم مصنفین اور ان کی خدمات

اگر انصاف کو راہ دی جائے اور کسی طرح کے تعصب اور تنگ نظری کو شعار نہ بنائیں تو یہ کہنا ہو گا کہ جدید اردو نثر کی ابتداء اور اس کا فروغ فورٹ ولیم کالج کا رہین منت ہے۔ عہد مغلیہ میں سرکاری زبان کا درجہ فاری کو حاصل تھا اور دفاتر میں وہی زبان رائج تھی۔ ریختہ نے فارسی کے متوازی اپنا اثر بڑھایا تھا لیکن بہر حال اس کی حیثیت ثانوی تھی اور اہل ادب فارسی میں دستگاہ پیدا کرنے کو قابل فخر بات سمجھتے تھے ۔ عوام میں اردو بولی اور کبھی جاتی تھی، مقبول بھی تھی لیکن خود اس کے اسالیب پر فارسی کا اثر تھا۔ عبارتیں متقی و سیع لکھی جاتی تھیں ۔ طرز ادا میں غیر ضروری تکلفات کی بھر مار رہتی تھی۔ اہل زبان وفن نثر سے زیادہ شاعری کو بنائے فخر مانتے تھے یہاں تک کہ غلط

نوید اور عام ضرورتوں کی ترسیل میں بھی شعر کونثر پر فوقیت دیتے تھے۔ انگریزوں نے جب کاروبار حکومت سنبھالا تو عوام سے رابطہ استوار کرنے کے لئے انہیں

کسی وسیلے کی ضرورت تھی۔ وہ فاری سے بھی یہ کام لے سکتے تھے لیکن سیاسی نفسیات مانع تھی اس لئے اُنہوں نے اردو کو فارسی پر ترجیح دی اور سادہ سلیس اور جدید و رواں اردو نثر کی ترویج و اشاعت کو حاکم اور رعایا کے درمیان رابطہ ترسیل بنایا ۔ اس کام کے لئے انہوں نے وار جولائی ۱۸۰۰ ء کو فورٹ ولیم کالج قائم کیا جہاں ترجمے اور سادہ و عام فہم اردو نثری ادب کے فروغ کا اہتمام کیا۔ یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل لارڈ ویلزلی کی دور بینی اور موقع شناسی کی بہترین مثال تھی ۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سید عبد اللطیف لکھتے ہیں:

ایسٹ انڈیا کمپنی نے فورٹ ولیم کالج کو بالکل افادی بنیاد پر قائم کیا تھا۔ تنظمائے کمپنی کا منشا کلکتہ میں چندار باب قلم کو یکجا کر کے ان سے اپنے انگر یز اہل کاروں اور عہدہ داروں کیلئے ایسی سلیس درسی کتا میں لکھوانا تھا جن کا طرز بیان شاعرانہ

نزاکتوں اور لفظی موشگافیوں کی بجائے سیدھا سادہ اور عام فہم ہو۔ اس کالج کے تقریبا تمام مصنفوں کو اس بات کا بہت کم موقع دیا گیا کہ وہ قلم کی سحر کاریوں سے اپنے ذاتی جذبات و خیالات کی ترجمانی کرتے۔ کالج کے ارباب اقتدار کو ضروری نصابی کتب کی تیاری میں عجلت تھی۔ اس لئے ان مصنفوں سے بجائے مستقل نا میں تصنیف کرانے کے مشہور متبادل اور بالخصوص فارسی کی عام پسند کتابوں کے ترجمے کرائے گئے ۔'' پیش لفظ ارباب نثر اردو)

ڈاکٹر جان گل کرسٹ اوائل انیسویں صدی میں فورٹ ولیم کالج کے پرنسپل تھے۔ نہایت بیدار مغز آدمی تھے ۔ ان کی انتھک کاوشوں سے ہی اردو نثر کو وہ فروغ ملا کہ سرکاری زبان بننے کا

مرتبہ حاصل کر سکی۔ انہوں نے خود یہ زبان سیکھی اور ہندوستانی طرز معاشرت میں رچ بس گئے خود انہوں نے اردو زبان میں کئی کتابیں لکھیں اور جب اپنے وطن ایڈ مبرا (برطانیہ) واپس ہوئے تو میں اردو کے پروفیسر رہے۔ ان کی تصنیفات کی فہرست (Oriental Institute) وہاں ادارہ شرقیہ ڈاکٹر گریرین نے اپنی کتاب " النگوسٹک سروے آف انڈیا میں دی ہے۔ بابائے اردو

مولوی عبد الحق ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

“جو احسان ولی نے اردو شاعری پر کیا تھا، وہی احسان گلکرسٹ نے اردو نثر پر کیا ہے۔"

(بحوالہ مغربی بنگال کا شعری و نثری ادب مرتبین: شاھد ساز محمد امتیاز احمد ص: ۳۲۳) گل کرسٹ ہی کے انتظام اور ماتحتی میں ایک جماعت ہندوستانیوں کے کالج میں قائم ہوئی پھر دلی لکھنو رام پور لاہور سے مشہور اہل ادب کھنچ کھینچ کر کلکتہ آنے لگے۔ سبب اس کا کچھ تو تلاش معاش تھا اور کچھ ان علاقوں کی سیاسی و اقتصادی تباہی تھی ۔ بہر حال فورٹ ولیم کالج میں اردو دانوں کا ایک بڑا حلقہ قائم ہو گیا جس نے تصنیف، تالیف اور تراجم کے کام بڑے پیمانے پر گئے۔ ان میں سے چند اہم ناموں کے بارے میں بعض معلومات ہم دے رہے ہیں تاکہ ان کی خدمات کا مختصر اہی سہی اندازہ ہو سکے:

میر امن دہلوی: آپ دہلی کی طوائف الملوکی کے دور میں پٹنہ ہوتے ہوئے کلکتہ آئے۔ میر بہادر علی حسینی کے توسط سے جان گل کرسٹ سے ملے اور ان کی فرمائش پر فاری قصہ چہار درویش کو

سلیس زبان میں ’’باغ و بہار کے نام سے پیش کیا۔ یہ کتاب اپنی سادگی اور سلامت کی بناء پر انگریزوں اور ہندوستانیوں میں مقبول ہوئی۔ اس کتاب کی زبان سادہ لیکن پر تاثیر ہے۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ دنیا کی مختلف زبانوں بشمول انگریزی اور فرانسیسی میں اس کے ترجمے ہوئے اور اس کے کئی ایڈیشن کلکتہ ، مدر اس لکھنو اور لندن سے شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ " گنج خوبی" کے نام سے بھی ایک کتاب ملتی ہے۔ ان کے انتقال کے متعلق کوئی واضح دستاویز موجود نہیں۔ پروفیسر عبدالمنان (سابق صدر ، شعبۂ اردو ، کلکتہ یو نیورسٹی) نے میر امن دہلوی کی نثری خدمات کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے ۔ یہ مقالہ ۱۹۹۴ء میں کولکاتا سے شائع ہوا۔

میر بہادر علی حسینی: آپ کے والد کانام سید عبداللہ کا ظم تھا۔ بیشتر حالات زندگی پر وہ خفا میں ہیں۔ ۲ رمتی ۱۸۰۱ ء کو ان کا تقرر فورٹ ولیم کالج میں بحیثیت میر منشی ہوا۔ آپ نے اخلاق ہندی کے نام سے سنسکرت کتاب ’’ہتوا پدیش کا صاف اور سلیس اردو ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ میر حسن کی مشہور مثنوی سحر البیان کوشتہ د رفتہ بے تکلف اردو میں نظر بے نظیر مثنوی : میر حسن کا قصہ کے نام سے لکھا نیز گل کر سنگر امر کا خلاصہ " رسالہ گل کرسٹ‘‘ کے نام سے لکھا جو مفید عام ترویج نثر اردو کا ایک اہم قدم مانا جاتا ہے۔ صوبہ آسام کی تاریخ کے حوالے سے ایک ولی احمد شہاب الدین طالش کی فارسی کتاب کا ترجمہ

آپ نے " تاریخ آسام کے نام سے کیا، مگر بعض وجوہ یہ کتاب شائع نہیں کی ہوئی۔

میر شیر علی افسوس : آپ ۱۷۳۵ء میں دلی میں پیدا ہوئے ۔ اپنے والد علی مظفر خاں کے ساتھ کچھ عرصہ لکھنو میں قیام کیا اور ایک نواب کے گھر بچوں کے اتالیق مقرر ہوئے۔ لکھنو میں آپ کو بڑے شعراء کی صحبت حاصل ہوئی۔ لکھنو کے معاشی بحران کے بعد طویل عرصہ پٹنہ میں مقیم رہے جہاں آپ کے والد پہلے میر جعفر اور پھر میر قاسم کے توپ خانہ میں داورنے کی ذمہ داری نبھارہے تھے۔

افسوس ۹۴ ر برس کی عمر میں کلکتہ آئے اور فورٹ ولیم کالج میں میرٹی کے ممتاز عہدے پر فائز ہوئے ۔ ۱۸۰۹ ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کی اہم کتابوں میں اردو ترجمہ گلستان سعدی موسوم بہ باغ اردو نہایت سلیس اور عام فہم اردو میں لکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ آرائش محفل" کے نام سے ہندوستان کے جغرافیائی حالات و مختصر تاریخ پر کتاب لکھی۔ آپ کے کلام کا مجموعہ " دیوان افسوس غیر مطبوعہ صورت میں موجود ہے، لیکن کلیات افسوس (مرتبہ سید ظہیر احسن) ادارہ تحقیقات اردو، پٹنہ سے ۱۹۶۱ ء میں شائع ہوئی ۔

سید حیدر بخش حیدری: آپ سید ابوالحسن کے فرزند تھے اور دہلی میں آپ کی ولادت ۱۷۶۰ء میں ہوئی۔ یہاں سیاسی شورشوں کے سبب آپ کے والد بنارس چلے آئے اور نواب علی ابراہیم خاں خلیل کے ہاں ملازم ہو گے علم ہوا کہ کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج میں ملازمت کے کئی مواقع دستیاب ہیں تو آپ کلکتہ تشریف لائے اور فورٹ ولیم کالج میں منشی کے عہدے پر مامور ہوئے ۔ یہاں انھوں نے زیادہ تر ترجمے کا کام کیا اور تقریبا دس کتابیں لکھیں جن میں " قصہ مہر و ماہ " " قصہ لیلی مجنوں"(فارسی سے ترجمہ) "طوطا کہانی " (غالبا طوطی نامے کا فارسی سے سلیس اردو میں ترجمہ) :

" آرائش محفل" (قصہ حاتم طائی کا نہایت سلیس اردو میں ترجمہ) : " تاریخ نادری" (ترجمہ نادر نامه از منشی مرزا مهدی) "هفت پیکر" " گل مغفرت " (ترجمہ روضۃ الشہداء ملا واعظ کا شفی):" گلزار دانش" (ترجمه بهار دانش از شیخ عنایت الله) : "گلشن ہند وغیرہ شامل ہیں۔

مرزا کاظم علی جوان: دلی کے باشندے تھے۔ دلی کی تباہی کے بعد پہلے فیض آباد اور پھر لکھنو گئے اور جلد ہی اپنے فن کی بدولت وہاں کے اہم شعراء میں شمار کئے جانے لگے۔ وہاں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد جنوری ۱۸۰۱ء میں کلکتہ چلے آئے ۔ فورٹ ولیم کالج میں کافی عرصہ تک منشی کی خدمات انجام دیں ۔ شیر علی افسوس کے انتقال ۱۸۰۹ء کے بعد جب تارنی چون مترا میر نشی مقرر ہوئے تو آپ کو ان کا نائب یعنی سکنڈ نٹی بنایا گیا ۔ آپ اردو کے علاوہ عربی ، فاری اور برج بھاشا پر بھی عبور رکھتے تھے۔ آپ نے کالی داس کے ناٹک شکنتا کا اردوترجمہ قرآن کریم کا ترجمہ نامکمل) ، فارسی تاریخ فرشتہ جو سلاطین ہمنی کی تاریخ سے متعلق ہے کا سلیس اردو ترجمہ ہے۔

علاوہ ازیں سنگھاسن بتیسی " اور " بارہ ماسہ" کا للولال جی کوی کے ساتھ مل کر سنسکرت سے اردو ترجمہ کیا۔ آپ بھی شاعری سے شغف رکھتے تھے تا ہم کوئی دیوان مرتب نہیں کیا۔ نہال چند لاہوری : آپ کے اجداد دیلی کے رہنے والے تھے، بعد میں لاہور چلے گئے تاہم فورٹ ولیم کالج میں منشیوں کی تقرری کے وقت نہال چند لاہور سے کلکتہ آگئے ۔ آپ کا لج کے با قاعدہ منشیوں میں نہیں تھے لیکن کالج کے لیے تصنیف و تالیف کا کام آپ نے گل کرسٹ کی ایما پر کیا۔ یہاں انھوں نے مذہب مشق کے نام سے گل بکاولی (فارسی قصہ از شیخ عزت اللہ بنگالی) کا سلیس اردو نثر میں ترجمہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی مقبولیت کو دیکھ کر دیا شنکر نیم نے گلزار نسیم ک نام سے اس نظم کو جامہ پہنایا۔

مظہر علی خاں ولا : آپ نے ممنون ، مرزا جان پیش اور نظام ہمدانی مصحفی سے مشہورہ سخن کیا۔ فورٹ ولیم کالج سے وابستگی کے بعد آپ نے فارسی کتاب پند نامہ " (از سعدی) کا اردو ترجمہ، ناصر علی خان بلگرامی کی "جفت گلشن کا اردو ترجمہ " قصہ مادھوتل کام کنڈ لا کا ترجمہ ، موتی رام کشر کی تصنیف کا بھاشا سے اردو میں ترجمہ صورت کشر کی بے تال چیپسی کا اردو ترجمہ للولال

جی کوی کے ساتھ مل کر کیا۔ فارسی کتابوں " تاریخ شیر شاہی“ اور ” تاریخ جہانگیر شاہی کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ولا ایک کامیاب اور زود گو شاعر بھی تھے۔ آپ نے غزلوں ، رباعیوں قطعوں مثنویوں اور قصیدوں سب پر طبع آزمائی کی۔ آپ کی نغزلوں کا دیوان بھی ملتا ہے۔ عبدالستار شاہدی (سابق

صدر شعبۂ اردو، مولانا آزاد کالج کلکتہ) نے پروفیسر حافظ طاہر علی کی نگرانی میں وشو بھارتی یونیورسٹی ، شانتی نکین سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی جو ہنوز شرمندہ اشاعت نہیں ہو سکی۔

مرزا علی لطف: آپ کالج کے باضابطہ منشیوں میں نہیں تھے۔ آپ کے اجداد ایران سے ہجرت کر کے دہلی تشریف لائے اور وہاں کی تباہی کے بعد براہ عظیم آباد صوبہ بنگال کی راجدھانی مرشد آباد تشریف لائے ۔ مرشد آباد کلکتہ سے قریب تھا۔ فورٹ ولیم کالج کا شہرہ سن کر لطف نے بھی کلکتہ کا رخ کیا۔ یہاں گل کرسٹ نے ان سے اردو کا مشہور تذکرہ "گلشن ہند“ لکھوایا جس کی بنا پر آپ تاریخ لکھا ہوا پہلا ادب اردو میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ واضح رہے کہ گلشن ہند اردو شاعروں کا اردو میں تذکرہ ہے۔

للولال جی : آپ ہندی زبان کے مشہور عالم اور کوی تھے۔ ان کے والد کا نام چین سکھ تھا۔ فورٹ ولیم کالج میں آپ نے راست کسی کتاب کا اردو میں ترجمہ نہیں کیا بلکہ اردو متر جمعین کو سنسکرت اور ہندی کی اہم کتابوں کے ترجمے میں بڑا تعاون کیا۔ آپ نے جن کتابوں کو منسکرت سے ہندی میں ترجمہ کیا ان میں " بیتال پچیسی ، قصہ مادھونل"، "لطائف ہندی اور برج بھاشا کے قواعد وغیرہ اہم ہیں۔ آپ بڑے فعال اور باصلاحیت قلم کار تھے اور کالج کے پرنسپل ولیم ٹیلر نے ان کی

بڑی تعریف کی ہے۔ ان منشیوں کے علاوہ خلیل علی خاں اشک نے ”قصہ امیر حمزہ ، قصہ رضوان شاہ،

انتخاب سلطانیہ اردو اور اکبر نامہ ، عبداللہ مسکین نے " مرثیہ ہائے مسکین ، مرزا محمد فطرت نے عہد نامہ جدید محی الدین فیض نے چشمہ فیض سید حمید الین بہاری نے ”خوان الوان، شیخ حفیظ الدین نے خرد افروز ، ابوالفضل کی ” عیار دانش کا اردو ترجمہ ، مولوی اکرام علی نے اخوان الصفا کا اردو ترجمہ ، بینی نرائن جہاں نے "دیوانِ جہاں مع تذکرۂ شعرائے ہندوستانی چار گلشن اور تنبیہ الغافلین از الاسلام (عربی) ہدایت اسلام (اردو) شاہ رفیع الدین کا اردو ترجمہ، اور مولوی امانت اللہ نے ہدایت اخلاق جلالی کا اردو میں ترجمہ کیا۔

فورٹ ولیم کالج کی بدولت تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ ترجمے کی اہمیت بھی واضح ہوئی ۔ منظم طور پر ترجموں کی مساعی سے اردو نثر میں ترجموں کی روایت کا آغاز ہوا اور انیسویں اور بیسویں صدی میں اردو نثر میں ترجمہ کرنے کی جتنی تحریکیں شروع ہوئیں ان کے پس پردہ

فورٹ ولیم کالج کا اثر کار فرما رہا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے منشیوں نے اردو نثر کے حوالے سے جو جلیل القدر کام انجام دیا ہے، اس کی اہمیت اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ہمیشہ رہے گی ۔ اس تعلق سے شانتی رنجن بھٹا چاریہ اپنے مقالہ بنگال میں اردو کا نثری ادب، ابتدا سے انیسویں صدی کے

صحیح معنوں میں ادبی نثر کی باضابطہ تحریک فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے شروع

ہوئی اور بول چال کی زبان سے قریبی تعلق رکھتے ہوئے صفائی اور سلاست کے لحاظ سے ادبی نثر کی پہلی اینٹ اس کالج میں رکھی گئی لیکن یہ حقیقت دلچسپی سے خالی نہیں کہ جان گلکرسٹ یا دیگر " حاکمان عالیشان" کی فرمائش پر جس نثری ادب کی تخلیق فورٹ ولیم کالج میں کی گئی ان کے بیشتر فنکار بنگال کے باشندے نہیں تھے بلکہ وہ دیگر صوبوں سے روزگار کے سلسلے میں کلکتہ آئے تھے اور حالانکہ وہ سب ہی شاعر تھے لیکن پیٹ کی خاطر اُن لوگوں نے کلکتہ میں مجبور احاکموں کی فرمائش کے مطابق عام فہم زبان میں نثری ادب کی تخلیق کی اور جن تخلیقات میں سے تقریبا تمام ہی عربی، فارسی اور سنسکرت ادب سے ترجمہ یا ان زبانوں کی تصانیف کے نقش قدم پر لکھی گئی کتابیں رہی ہیں لیکن اس فرمائشی ادب نے وہ مکمل کھلائے کہ نثری ادب کی ترقی کے لئے راہیں کھل گئیں ۔"

بحوالہ مغربی بنگال کا شعری و نثری ادب مرتبین: شاہد ساز محمد امتیاز احمد ص: ۳۲۳-۳۲۴) اس) ضمن میں پروفیسر عبد المنان (سابق صدر، شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی) کی رائے بھی

ملاحظہ فرمائیں جو نہایت اہم ہے:

اردو نثر کوارتقا کی منزلوں تک پہنچانے میں فورٹ ولیم کالج کے منشیوں کا اہم رول رہا ہے۔ یہ لوگ کالج میں درس و تدریس کا ہی کام نہیں کرتے تھے بلکہ تصنیف و تالیف سے بھی گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں کالج میں صلہ وانعام کی غرض سے اپنی کتا میں بھی داخل کی تھیں۔ فورٹ ولیم کالج نہ صرف ایک تدریسی ادارہ تھا بلکہ جدید اردو نثر کی ایک اہم کڑی تھا۔ کوئی ادبی تحریک جیالے مصنفوں اور جانباز فنکاروں کی وجہ سے آگے بڑھتی ہے ۔ فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی خدمات اردو نثر کے ارتقا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان کے نثری کارنامے ایک تحریک کی شکل اختیار کر چکے ہیں ۔ اگر جدید نثر مختلف خیالات و معتقدات کے پیش کرنے کا اہم وسیلہ بن گئی اور اردو اس قابل ہوگئی

کہ دوسری ترقی یافتہ زبانوں سے آنکھیں ملا سکے تو اس کی کامیابی کا سہرا

فورٹ ولیم کالج کے منشیوں کے سر بھی بندھنا چاہیے

(کتاب میر امن دہلوی کی نثری خدمات اشاعت: ۱۹۹۴، ص ۶۲) اردو نثر کے اس اہم مرکز کی بدولت تصنیف و تالیف کے کام میں موضوع کی افادیت کے علاوہ اسلوب بیان کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہوئی ۔ قلم کاروں کو اس بات کا احساس ہوا کہ جس قدر موضوع اہمیت کا حامل ہے اسی قدر اسلوب بیان کی سادگی ، سلاست اور زبان کا روزمرہ کے مطابق ہونا بھی ضروری ہے تا کہ قاری بات کو صحیح طور پر مجھ سکے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ مطالب کو سادہ ، آسان اور عام فہم انداز سے بیان کیا جائے۔

فورٹ ولیم کالج ۲۴ جنوری ۱۸۵۴ء کو بند کر دیا گیا لیکن ان ۵۴ سے برسوں کے دوران یہاں کے منشیوں ، ترجمہ نگاروں اور قلم کاروں کی مساعی جمیلہ کی بدولت اردو نثر بلند مرتبہ کی حامل ہوئی۔ اس سے قبل اردو زبان یا تو پر تکلف داستان سرائی تک محدود تھی یا پھر اسے مذہبی اور اخلاقی تبلیغ کی زبان تصور کیا جاتا تھا لیکن فورٹ ولیم کالج میں لکھی جانے والی کتابوں نے یہ ثابت کر دیا کہ اردو زبان میں اتنی وسعت اور صلاحیت ہے کہ اس میں تاریخ ، جغرافیہ ، سائنس ، داستان، تذکرہ ، غرضیکہ ہر موضوع اور مضمون کو آسانی سے بیان کیا جا سکتا ہے۔

شاہ مقبول احمد : حیات و خدمات: جائزہ :

پروفیسر شاہ مقبول احمد کی نجابت ، شرافت اور متانت موروثی تھی کہ بہار کے خانوادہ حضرت مخدوم شاہ یحییٰ منیری سے نسبت رکھتے تھے۔ بہار کے آب و گل میں ابتدائی ساڑھے سترہ سال گزارے، پروان چڑھے۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے کلکتہ گئے تو بقیہ ساڑھے چھیاسٹھ سالہ زندگی کو کلکتہ کے آب و گل میں ہی رچا بسا کر گل گلزار بنایا اور یہیں سپردخاک ہوئے ۔ مولانا آزاد کالج اور کلکتہ یو نیورسٹی ٹی میں ۳۷ سال تدریسی خدمات انجام دیں، کئی نسلوں کی علمی پیاس بجھائی اور ایسی ذہنی آبیاری کی کہ بعضے صاحب علم و کمال ہوئے ۔ اپنے فکر و قلم کا جو ہر دکھایا تو اردو ادب مالا مال ہوا اور اردو لسانیات کے کچھ ایسے گوشے منور کئے ، جو عام نظروں سے اوجھل تھے۔ یوں اپنی تدریسی خدمات سے درجہ احترام اور فکر و قلم سے علمی دنیا میں اپنا اعتبار قائم کیا۔ اس کے باوجود ان کی خدمات کی قدر دانی اتنی نہ ہو سکی جس کے یہ ستحق تھے۔ اس کی ایک وجہ بقول سالک لکھنوی ہی تھی کہ ان کی خاموش و قانع طبیعت اپنا ڈھنڈورا نہ پٹواسکی ۔ شاید خاندانی روایات،

"فطری شرافت اور وقار نے اس کی اجازت نہیں دی۔

دوسری وجہ قیصر شمیم صاحب نے یہ بتائی ہے

"پروفیسر موصوف کے زمانے میں علاقائی یا حلقہ داری حد بندیوں سے نکل کر کام

کرنے والے انصاف پسند ناقدین کا (کلکتہ میں) فقدان تھا۔" (دیباچہ کتاب ہذا)

اس حد بندی کو ڈاکٹر شفیع الرحمن نے توڑا اور شاہ مقبول احمد مرحوم کی حیات و خدمات کو موضوع بنا کر تحقیقی مقالہ رقم کیا۔ اس پر انہیں کلکتہ یو نیورٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی۔ یہ

کتاب اس مقالہ کی تلخیص ہے۔

شاہ صاحب کو جو علمی گہرائی و گیرائی تحقیقی وتنقیدی بصیرت اور تخلیقی جودت ودیعت تھی

مقام افسوس ہے کہ ان کا خاطر خواہ وہ اظہار نہ کر سکے۔ انہوں نے خود اپنی نگارشات کے تعین مجموعے (۱) چنداد بی مسائل (۱۹۶۴ء) ، (۲) پانچ افسانے اور انشائے (۱۹۸۰ء)، (۳) تشریحات و اشارات (۱۹۸۶ء) کے نام سے شائع کئے ۔ ان کی وفات کے بعد جس نوع کی بھی ان کی نگارشات دستیاب ہو سکیں انہیں اشرف احمد جعفری نے مرتب کیا، یوں (۴) مجموعہ شخصیات و تاثرات کے نام سے ۲۰۰۲ء میں منظر عام پر آیا لیکن یہ جو کچھ بھی ہے بلحاظ کیفیت شاہ صاحب کی قد آوری پر دال ہے۔ ان کے جو شعری نمونے منظر عام پر آئے وہ بھی موصوف کے ستھرے شعری مذاق کی غمازی کرتے ہیں مگر شاعری ہو یا افسانہ نگاری، پتہ نہیں کیوں؟ انہوں نے اپنے تخلیقی جو ہر کو کھل کھیلنے نہیں دیا۔ پھر بھی جو نقش ہائے جمیل سامنے آئے ہیں ان کے حوالے سے ڈاکٹر شفیع الرحمنر نے شاہ صاحب کی گراں مائیگی اور قد آوری کو اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔

پیش نظر تصنیف میں ڈاکٹر موصوف نے خاندانی پس منظر میں پیدائش و جائے پیدائش مرحلہ تعلیم ، ملازمت ازدواج و اولاد، شکل و شباہت ، وضع قطع ، اخلاق و کردار ، تلمند و تلانده ، انداز تدریس، خویش و اقارب و معاصرین سے روابط کے حوالے سے شاہ صاحب کی شخصیت کو جس طرح پہلے باب میں نمایاں کیا ہے وہ باور کراتا ہے کہ مصنف نے مرحلہ تحقیق میں اپنا پتہ پانی کیا ہے۔ لہذا بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ اس سے جو شخصیت ابھرتی ہے وہ ایسی دلآویز ہے کہ ان جیسی صالح اقدار کی پاسدار شخصیت اب نایاب ہے۔

دوسرے باب میں شاہ صاحب کی جملہ نگارشات کا بعنوانات: افسانے ، انشائیے ، تنقید، مضامین ، خطوط اور پیش لفظ ، دیباچے ، تقاریظ، باعتبارفن ، صنف اور موضوع ، جائزہ لیا ہے اور ہر نوع تحریر کی معنویت وافادیت روشن کر کے صاحب تحریر کی اہمیت واضح کی ہے۔ افسانہ نگاری کی بابت بتایا ہے کہ شاہ صاحب کے چند ہی افسانے منظر عام پر آئے مگر جو ہیں، باعتبار فکر وفن اور وقت و مقام ان کی اساسی اہمیت ہے۔ انہوں نے ۱۹۴۰ء سے افسانہ نگاری شروع کی ۔ یوں مغربی بنگال کے دور اول کے افسانہ نگار ہیں۔ مستند حوالوں سے واضح کیا ہے کہ جب بنگال میں اردو افسانہ نگاری رومانوی فکر کی اساس پر پروان چڑھ رہی تھی اس وقت شاہ صاحب نے اپنے افسانوں

یں ترقی پند گر کر اور اور مغربی ہال میں ترقی پندار دوافسانہ نگری کی یوالی پہلی جور میں کے افسانے ۱۹۴۰ تا ۱۹۴۵ء کے نوشتہ ہیں۔ اس مجموعہ میں شامل افسانہ ” زیور کی اہم خصوصیت یہ

بتائی ہے کہ اس میں بہار کے مگہی علاقے کے شرفاء د عام لوگوں کے گھروں میں بولی جانے والی زبان کو برت کر صرف زبان ہی نہیں ان کی تہذیب کو بھی محفوظ کر دیا ہے تا کہ آنے والی نسلیں اس علاقے کی لسانی، تہذیبی اور ثقافتی وراثت سے آگاہ ہو سکیں۔ تمام افسانوں کا فنی فکری اور اسلوبیاتی جائزہ لیا ہے۔ ان کے موضوعات کی اہمیت افسانوں کے زمانی و مکانی تناظر میں نمایاں کی ہے۔ ان کے شستہ ، شگفتہ و برجستہ اسلو اوجہ بتائی ہے اور انہیں پریم چند ، رتن ناتھ سرشار اور علی عباس حسینی سے متاثر بتایا ہے۔ انشائیہ کے اسلوب کو رشید احمد صدیقی سے متاثر ٹھہرایا ہے جس کا وصف یہ ہے کہ طنز ، شوخی اور نکتہ آفرینی مل کر ان کی متوازن ظرافت کو ایک رچی ہوئی شگفتگی عطا کرتی ہے۔ اس باب کا اہم وصف یہ ہے کہ اس میں شاہ صاحب کی تنقیدی بصیرت سے زیادہ تحقیقی بصیرت جلوہ گر ہوئی ہے ، لسانیات سے گہری وابستگی نمایاں ہوئی ہے، بہار کی بولی ٹھولی کو اردو لسانیات کا درجہ دینے کی کوشش کو وقعت ملی ہے اور شاہ صاحب کی شخصیت شناسی کا ملکہ سامنے آیا ہے۔ اس طرح بقول قیصر شمیم

"ان کی (شاہ صاحب) چاروں کتابوں کی نگارشات میں سے ایک ایک کا بھر پور جائزہ لیتے ہوئے ہر تحریر کی اہمیت اجاگر کرنے کی اچھی کوشش کی گئی ہے جس سے یہ باب پروفیسر شاہ مقبول احمد کی ادبی شناس نامے کا دیباچہ بن گیا ہے۔"

(چند سطریں ص:7)

شاہ صاحب کا قول ہے کہ یخن سنجی کا سوتا ثانوی تعلیم کے دوران عنفوان شباب میں ہی پھوٹا کہ طبع موزوں پایا تھا۔ پھر تخلیقی اظہار کو جلا بخشنے کیلئے علامہ وحشت کلکتوی سے شرف تلمذ حاصل کیا اس کے باوجود ان کی شعری کائنات بھی افسانوی کائنات کی ہی مثل ہے جبکہ شاہ صاحب کا تقریباً پورا د ور جو کلکتہ میں گذرا ، اس میں شعری بزم آرائیوں کی بہار تھی اور کلکتہ میں زمزمہ سنجوں کی ایسی گہما گہمی تھی کہ اس کی نظیر اردو شاعری کی تاریخ میں کہیں اور نہیں ملتی۔ ایسے سخن پرور اور تکلش ماحول

میں شاہ صاحب کی طبع موزوں خوابیدہ رہی ، حیرت ہوتی ہے کہ ان کی کل پندرہ غزلیں ، چار نظمیں اور ایک قطعہ ہی دستیاب ہوئے۔ پھر بھی جو کچھ ہے اس نے شاہ صاحب کی شاعرانہ حیثیت ضرور قائم کر دی ہے۔ اس کا اعتراف ان کے ہمعصروں نے بھی کیا ہے۔ بزرگ شاعر وادیب علاقمہ شبلی رقمطراز ہیں:

اپنی اہلیہ کی وفات پر انہوں نے جو نظمیں لکھیں، وہ ان کی دلی جذبات واحساسات کی آئینہ دار تو ہیں ہی، ساتھ ہی ساتھ ان کی ادبی اہمیت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا ۔‘‘ لہٰذا آخری باب میں مصنف نے غزلوں اور نظموں کے حوالے سے شاہ صاحب کی

قادر الکلامی ثابت کی ہے۔

اس طور ، اس تصنیف میں شاہ صاحب کی شخصیت اور کارنامے بخوبی اجاگر ہوئے ہیں مگر شاعری اور افسانے کے حوالے سے تخلیق کار، دیگر نگارشات کے حوالے سے صاحب اسلوب انشا پرداز

محقق اور ماہر لسانیات ، وہ جتنا ابھر کر سامنے آئے ہیں اتنا ان کا تنقیدی اسلوب کھل کر سامنے نہیں آیا ، جبکہ شاہ صاحب کی تخلیقات کے مقابلے میں تنقیدی نگارشات کا پلڑا بھاری ہے۔ یہ پہلو اس میں تشنہ لگتا ہے۔ اس لئے کہ مصنف نے ان کے نوشتہ دیباچے، پیش لفظ ، ، تقاریظ اور تنقیدی مضامین کے جائزے میں تعارفی انداز اختیار کیا ہے اور یہ تعارفی پہلو کہیں کہیں تکرار بیانی کو بھی اہ دے گیا ہے۔ جس دور میں شاہ صاحب نے تنقیدی مضامین پر قلم کئے وہ بنگال میں اردو تنقید نگاری کا دور اولیں تھا۔ اگر شاہ صاحب کے جملہ تنقیدی نگارشات کا کماحقہ تجزیہ کیا جاتا تو ن کے تنقیدی اسلوب کے ساتھ بنگال میں اردو تنقید نگاری کا پس منظر بھی واضح ہو جاتا اور اس تصنیف کی افادیت دو چند ہو جاتی ۔ پھر بھی اس تصنیف میں ڈاکٹر شفیع الرحمن کی تحقیقی بصیرت جس طرح بروئے کار آئی ہے وہ داد کی مستحق ہے۔ ان کی یہ کاوش ” مقبول شناسی کی راہ استوار کرنے میں کامیاب ہے اور اس ضمن میں حوالہ جاتی اہمیت کی حامل ہے۔ اس لئے یہ پذیرائی کی مستحق ہے

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز : اردو اور سائنس کے نکتہ شناس

ڈاکٹرمحمد اسلم پرویز تخلیقی عمل کے اعجاز سےمختلف الجہات معانی کے با ترسیل امکانات سے سرفراز کرنے والے قلم کار کا نام ہے۔ ان کی تحریریں نامیاتی وحدت اور تجسیم کاری کے معیار پر پوری اترتی ہیں۔ اردو میں عام طور پر جمالیاتی سرشاری کا تجربہ فراہم کیا جاتا ہے لیکن جناب اسلم پرویز نے نباتاتی لب ولہجہ کا انوکھا بانکپن عطا کیا ہے۔ متنوع اور مصور تلاندات کا ایک سر چشمہ ہے جوان کی تحریر میں بہتا نظر آتا ہے۔ سائنسی اور قرآنی طرح نو کی دریافت کی کوشش ان کی اہم خصوصیت ہے۔ جہاں تک ان کی تقریر کی بات ہے، وہ بلند آہنگ لہجہ اختیار نہیں کرتے بلکہ زیر لبی سے کام لیتے ہیں جو فطرت کی آواز سے ہم آہنگ ہے۔

اردو میں سائنسی موضوعات پر جن قلم کاروں کی تخلیقات معتبر مانی جاتی ہیں ، ان میں ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کا نام نمایاں ہے۔ موصوف کی شناخت ایک ماہر نباتات کے طور پر بھی ہے جس نے

تسلسل سے عام فہم زبان میں سائنس کی گتھیوں کو سلجھا کر روشن باب کھولے ہیں ، جن میں شناخت ہیں، کے عوامل ہیں اور تخلیقی تحقیقی اور فکری رویے ہیں ۔ ان کے موضوعات متنوع ہوتے ہیں۔ فضائی کثافت ، آبی کثافت ، خوراک کا مسئلہ، بڑھتی ہوئی آبادی پر روک ، پٹرول اور جنگلات جیسے اہم موضوعات کے ساتھ سورج ، توانائی ، چاند ستارے اور ان کبھی آشنا و نا آشنا موضوعات پر انھوں نے مضامین اور کتا بیں لکھی ہیں جن سے عام انسانوں کو روزانہ واسطہ پڑتا ہے۔ وہ بوٹانی (نباتات) کے استادر ہے ہیں لیکن اردو میں لکھ کر سرمایہ علم وادب میں اضافہ بھی کرتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر شفیع ایوب (جواہر لعل نہرو یو نیورٹی نئی دہلی) اپنے مضمون " معیاری تعلیم کے لئے ڈاکٹر اسلم پرویز کی

کاوشوں کو سلام میں موصوف کے علمی نظریے کا احاطہ کچھ ان الفاظ میں کرتے ہیں: ڈاکٹر اسلم پرویز نہ صرف تعلیم کی ضرورت پر زور دیتے ہیں بلکہ معیاری

تعلیم کی وکالت کرتے ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے، وہ دنیا کے مختلف ممالک کا تعلیمی دورہ کر چکے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ آدھی ادھوری جانکاری کے ساتھ حاصل کی گئی ڈگری کی آج کے زمانے میں کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ ڈگری کے ساتھ آپ کی علمی قابلیت بھی اعلیٰ درجے کی ہونی چاہیے۔ پھر "آپ تعصب کا رونا نہیں روتے پھریں گے ۔

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نومبر ۱۹۸۲ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ نباتات سے وابستہ ہوئے جہاں انھوں نے تدریسی خدمات انجام دیں۔ پھر ذاکر حسین کالج ، دہلی سے وابستہ ہوئے جہاں ۲۲ سال شعبے میں وہ استادر ہے۔ اپریل ۲۰۰۵ ء میں اسی کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے اور اپنی تدریسی و انتظامی زندگی کا بڑا حصہ یہاں گزارتے ہوئے اکتوبر ۲۰۱۵ ء میں اس وقت یہاں سے علیحدگی اختیار کی جب انھیں مولانا آزاد نیشنل اردو یو نیورسٹی (حیدرآباد) کے شیخ الجامعہ کے عہدہ جلیلہ پر فائز کیا گیا۔ ۲۰ اکتوبر ۲۰۱۵ء کو انھوں نے اس عہدے کا چارج لیا۔ واضح ہو کہ موصوف مارچ ۱۹۹۸ تا جون ۱۹۹۹ء مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے دہلی ریجنل سینٹر میں تاسیسی ریجنل ڈائریکٹر بھی رہ چکے تھے۔ اس دوران دیگر علمی و سماجی خدمات سے بھی ان کی وابستگی رہی ۔ ۱۹۹۴ء میں وہ

اسلامک فاؤنڈیشن فار سائنس اینڈ انوائرنمنٹ سے تعلیمی / ماحولیاتی رضا کار کے طور پر وابستہ ہوئے ۔ جون ۲۰۱۳ء میں انھوں نے میمنا قرآنک ایجو کیشن ٹرسٹ کی بنیاد ڈالی اور اب بھی بحیثیت

ڈائریکٹر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ قرآن ، سائنس اور ماحولیات کے تعلق سے وہ ہمیشہ سے

سرگرم عمل رہے ہیں اور دنیا کے بہت سے ممالک میں اس موضوع پر خطاب بھی کر چکے ہیں۔ سائنسی مضامین پر مشتمل ان کی تین کتا بیں سائنس کی باتیں سائنس نامہ اور سائنس

پارے پا شائع ہو کر ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکی ہیں۔ قرآن اور علم کے رشتے کو اجاگر کرنے والی ان کی کتاب ” قرآن مسلمان اور سائنس“ کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں نیز اس کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کی سائنسی مضامین میں دلچسپی کے حوالے

سے معروف صحافی سہیل انجم نے لکھا ہے : انھوں نے پرانی کتابوں کے مارکیٹ سے اردو میں ترجمہ شد و روی کتابیں جو کہ میر پبلی کیشن سے شائع ہوتی تھیں، خرید کر پڑھنا شروع کیا۔ لیکن ان کو ترجمہ شدہ کتابوں میں کوئی لطف نہیں آتا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اور یجنل چیزیں پڑھنے کو ملیں ۔ اسی درمیان انھوں نے سائنس پر مضمون نگاری شروع کی اور ان کا پہلا اردو مضمون ۱۹۸۲ء میں قومی آواز میں شائع ہوا۔ ماہنامہ سائنس کی سلور جبلی، مطبوعہ تمثیل نو شمارہ جولائی ۲۰۱۷ ۔ جون ۲۰۱۸ ، ص ۲۵۸) ۱۹۹۲ء میں موصوف نے انجمن فروغ سائنس“ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا اور اسی کے تحت ان کی ادارت میں اردو ماہنامہ " سائنس“ (اجراء: فروری ۱۹۹۴ء) شائع ہو رہا ہے۔ اس ماہنامہ کے ۲۳ سال (۱۹۹۴ ۰ ۔ ۲۰۱۷ء) کے تمام شماروں کے مشمولات کا اشاریہ ڈاکٹر محمد کاظم

شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی) نے ۲۰۱۷ء میں ترتیب دیا ہے۔ ان کی کتاب " سائنس پارے پر نوبل انعام)
: یافتہ سائنس داں پروفیسر عبد السلام نے اپنی رائے اس طرح دی ہے

اردو میں سائنسی لٹریچر کی فراہمی اس برصغیر کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ مجھے بے حد خوشی ہے کہ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز اردو میں عام فہم سائنسی مضامین نہ صرف یہ کہ پابندی سے لکھ رہے ہیں، بلکہ ان کی تحریروں نے سائنس کے تقریبا سبھی جدید موضوعات کا احاطہ کیا ہے۔ بلا تامل یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو میں سائنسی صحافت کو از سر نو زندہ کرنے میں اس نوجوان نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم (سابق جنرل سکریٹری ، انجمن ترقی اردو ہند) ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کی کتاب

"سائنس کی باتیں" پر رائے دیتے ہوئے رقم طراز ہیں :

"-----اردو والوں میں سائنس کے مختلف شعبوں میں ماہرین کی تعداد بہت کم ہے اور جو ہیں وہ اپنی مادری زبان ، اردو کی طرف سے احساس کم تری میں کچھ ایسے------"

مبتلا ہیں کہ اردو میں نہیں بلکہ انگریزی میں لکھنا پسند کرتے ہیں۔ اردو زبان میں اسلم صاحب جیسے ذہین جنتی اور با صلاحیت نوجوان کی آمد پر ہمیں لال قالین

بچھا کر ان کا استقبال کرنا چاہئے ۔

(ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کے وائس چانسلر بننے پر جناب شاہد صدیقی (ایڈیٹر نئی دنیا دہلی

: لکھتے ہیں

"----حیدر آباد میں قائم اردو یو نیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدہ پر ایک قابل اردو اور ملت کی ہمدرد شخصیت کا تقرر عمل میں لایا گیا ہے جو یو نیورسٹی کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہیں کیونکہ اردو ذریعہ تعلیم کے مقاصد کے ساتھ قائم کی گئی یونیورسٹی کو ایک ایسی شخصیت دی گئی جو اردو داں بھی ہے اور اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے ان کا شاندار ریکارڈ موجود ہے-----"

(گواہ اردو ویکلی حیدر آباد ۳۰ را کتوبر ۔ ۱۵/ نومبر ۲۰۱۵ء

معروف طنز و مزاح نگار ڈاکٹر عابد معز (حیدر آباد) نے ان کی تقرری پر اپنے خیالات کا

اظہار اس طرح کیا ہے :

ڈاکٹر اسلم پرویز اعلیٰ ظرف انسان ہیں۔ ایسے اردو والے نہیں جو اردو کی روٹی کھا کر اسے نقصان پہنچارہے ہیں بلکہ اردو کی خدمت کر کے خود نقصان اٹھا لیتے ہیں ۔

(ایضا)

: ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز مدیر گواہ حیدر آباد کا ماننا ہے

چوں کہ سائنس کے اہم ترین شعبہ سے ان (ڈاکٹرمحمد اسلم پرویز) کا تعلق

ہے، اس لئے حقیقت پسندی ایسے افراد کی پہچان ہوتی ہے۔ حیات بخش منجیونی

(کہاں چھپی ہوتی ہے، اور اس کا استعمال کیسے کیا جانا چاہیے، وہ جانتے ہیں ۔ (ایضا

ڈاکٹر موصوف کی سائنسی موضوعات سے دلچسپی کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ

اب تک وہ ۴۰۰ سے زائد سائنسی نگارشات قلم بند کر چکے ہیں نیز چار ریاستوں کے نصابی کتب میں ان کے ابواب شامل ہیں۔ اپنے ایک مضمون

"Scientific Innovation and al-Mizan”

میں وہ قرآن میں موجود ماحولیاتی توازن کا تذکرہ یوں کرتے ہیں : ماحولیاتی توازن: یہ وہ توازن ہے جو ماحولیات کے مختلف عناصر کے درمیان ہوتا ہے۔ یہ نسبتا نیا تصور ہے جو پچھلے پچاس برسوں میں سامنے آیا ہے جب کہ چودہ سو سال قبل قرآن کریم میں بہت صاف طور پر اس مظہر کو بیان کیا گیا ہے: ہم نے تمام چیزیں تناسب اور توازن میں پیدا کی ہیں ۔“ (۴۹-۵۴) ہمارے ماحولیات کے مختلف عناصر کے درمیان پیمائش کا تصور یا توازن (المیزان) ہم پر اس وقت ظاہر ہوا جب ہم نے کائنات میں کچھ پریشان کن مظاہر کا نوٹس لیا۔ گرین ہاؤس کے مضر اثرات ان میں سے ایک مظہر ہیں۔ جینیٹک انجینئر نگ کی مختلف تکنیکوں کے ذریعہ لوگ کچھ ایسے مفید جینس کو ان جانداروں میں شامل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جن میں مذکورہ جینس فطری طور پر موجود نہیں ہیں۔ یہ کوشش سراسر ”اس قدرتی توازن کے مخالف ۔ ہے جو ایک جاندارکی تمام جینس میں موجود ہوتا ہے۔

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کے سائنسی نکات ذکر وفکر کے لحاظ سے شعور و آگہی سے بھر پور ہوتے ہیں۔ وہ معلومات بہم پہنچا کرنتی قدروں اور موشگافی کے متحرک کردار کے امین بنتے ہیں اور اطلاقی طریق کو عصر سے روشناس کرتے ہیں ۔ انھوں نے جدید اضافی سیاق میں صحت مند اشکال کوئی کثیر الوضع سائنسی ادبیت بخشی ہے۔ اس لیے ان کی تحریر معتبر اور قابل قدر قرار پاتی ہے۔ حیاتیاتی تسلسل کو انھوں نے مثبت رد عمل سے واضح کیا ہے۔ شاہد و ناظر منظر بن کر اپنے چاروں طرف کے منظر نامے کو خود کے اندر جذب کیا ہے اور ظاہری و باطنی رد عمل کو روئیدگی ، نوازش فطرت اور

پر تحرک انسانی رشتوں سے عبارت کیا ہے۔ اس لیے ان کے یہاں وضاحت اور قطعیت ملتی ہے۔